تبسم

(دوسرا ایڈیشن)

(یعنی)

ہندستان کے مقبول ترین مزاح نگار ادیب اور سنجیدہ ظرافت میں صاحب طرز انشا پرداز

حضرت شوکت تھانوی

کے اُن بائیس شاہکاروں کا مجموعہ جنمیں کا ہر مضمون مزاح لطیف کا ایک معیار تسلیم کیا گیا ہے۔ پہلا ایڈیشن ختم ہونے کے بعد مصنف کی نظر ثانی اور

متعدد جدید مضامین کے اضافہ کے ساتھ

جن سے مزاح نگار کے قلم کی شوخیوں میں ترقی اور مزاح کی شیرینی میں واقعات کی تلخی کو چھپانے کا اندازہ نہایت آسانی سے کیا جا سکتا ہے

مینیجر صدیق بک ڈپو۔ امین آباد پارک لکھنؤ

نے شائع کیا

باہتمام عابد علی خاں پرنٹر شاہی پریس نعمت اللہ روڈ لکھنؤ میں چھپا

فہرست مضامین

تقدیر

(از مولانا نیاز فتحپوری مدیر نگار لکھنؤ)

دنیا مصائب و آلام کی جگہ ہے یا لطف و مسرت کی، اس کا فیصلہ آج تک نہ ہو سکا، جو لوگ حور و قصور، کوثر و سلسبیل کے قائل ہیں وہ دنیا کو دار المحن کہہ کر آخرت کی امید پر ہر تکلیف کو جھیل رہے ہیں اور اسکے دور کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتے کہ مبادا یہاں کا ذرا سا آرام وہاں کے لذائذ میں کمی کر دے، جو زندگی کو صرف اسی دنیا کی چیز سمجھتے ہیں وہ یہاں کے ہر ہر لمحہ کو "شاہد و شعر ست و شراب و شکر" میں بسر کر دینا چاہتے ہیں، اُن کا خیال ہے کہ تھوڑی دیر کیلئے اگر جنت کے وجود کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو کیا۔

بہ فردوس روزن بدیوار کو — نظر بازی و ذوق دیدار کو

صبوحی خورم گر شراب طہور — کجا زہرۂ صبح و جام بلور

ایک زاہد شب زندہ دار کہتا ہے کہ اگر واقعی مرنے کے بعد حیات بعد الممات اور حور و قصور کا وجود ثابت ہوا، تو پھر دنیا میں گناہ کرنیوالے کیا کریں گے، ایک رند میخوار بھی یہی کہتا ہے کہ اگر یہ سب کسی کا "وعدۂ فردا" نکلا تو پھر بتاؤ "دادِ زندگی" کس نے دی اور کون خسارہ میں رہا، بہر حال یہ جھگڑا نہ کبھی طے ہوا نہ آئندہ ہوگا، مرنے کے بعد خدا ہی کو معلوم ہے کہ کیا ہوگا، اور کیا نہیں، اس لئے میرے نزدیک اس سے زیادہ حماقت کوئی نہیں کہ "شے حاصل" اور "اُمید موہوم" میں کوئی فرق نہ کیا جائے اور موجودہ زندگی کو صرف اس لئے رو رو کر گزار دیا جائے کہ کہیں اور جا کر ہنسنا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کہ "خوش باش دمے" کیا چیز ہے؟ وہ لوگ جو اپنی تمام تمناؤں کو پورا ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، جن کے یہاں کسی ارادہ کا پیدا ہو جانا اس کی تکمیل کا مترادف ہے، ان کے یہاں حقیقی لطف و مسرت کا وجود کبھی نہیں پایا جا سکتا اُن کے لئے تو پہلے ضرورت اسکی ہے کہ

خارم کن و در رہ گزر چارہ گرم ریز

اس لئے نشاط کا مفہوم حقیقتاً الم سے پیدا ہوتا ہے اور اس شخص کو ہم مسرت کا جستجو کرنے والا پائیں گے جس کو یہ چیز حاصل نہیں ہے یا ہاتھ سے

کھو چکا ہے۔ غالباً یہی وہ فلسفہ ہے جس کی بنا پر کہا جاتا ہو کہ "وہ شخص جو تمھیں ہنساتا ہو، بسا اوقات تم سے زیادہ مغموم ہوتا ہے"۔ ہر چند یہ کلیہ نہیں قرار دیا جاسکتا لیکن اس میں کلام نہیں کہ اگر کوئی شخص ایسا ہے جسکا دل غم سے معمور ہے اور چہرہ متبسم ہے تو اُس سے ڈرنا چاہیئے کیونکہ یہ فطرت کا زہر خند ہے اور دنیا میں اس سے زیادہ سخت مہلک ٹریجڈی اور کوئی نہیں ہوتی، چنانچہ دیکھا جاتا ہو کہ دنیا کی بعض ہستیاں جو صرف ہنسنے اور ہنسانے ہی میں بسر ہو جاتی ہیں فی الواقع حد درجہ ملول و غمگین ہوتی ہیں۔ دنیا انھیں دیکھ کر ہنستی ہو، اُن کی باتوں سے لطف و مسرّت حاصل کرتی ہے، لیکن وہ ہیں کہ اندر ہی اندر غم سے گھلی جارہی ہیں مثلاً چارلی چپلین کو دیکھ لیجئے کہ کون ہے جو اس کے حرکات پر ہنسی سے بیتاب نہیں ہو جاتا، لیکن خود اس نے جو اپنے حالات لکھے ہیں وہ رُلا دینے کی حد تک دردناک ہیں۔

جب مجھ سے جناب شوکت تھانوی کے مجموعۂ مضامین "بحر تبسم" پر اظہار رائے کی خواہش کی گئی اور میں اس خیال کو لیکر میز پر آیا تو سب سے پہلے یہی جستجو مجھ میں پیدا ہوئی کہ آیا شوکت صاحب کی مزاحیہ نگاری صرف اس لئے ہے کہ واقعی وہ رنج و الم سے بالکل بیگانہ ہیں یا یہ کہ وہ اپنے ہموم کو اس

پردے میں چھپانا چاہتے ہیں، کہا جاتا ہے ایک نقاد کے لئے یہ بھی کم ضروری نہیں کہ وہ صاحب تصنیف کے اندرونی حالات سے واقف ہو میں ہمیشہ اس قول کی حقیقت کو تسلیم کرتا ہوں، جب مجھے کسی واقف و شناسا کی تصنیف پر بحث کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ بحر تبسم" پر رائے زنی کرتے ہوئے بھی میری توجہ اس طرف منعطف ہوئی اور تصنیف سے قبل مصنف کی صورت اور اُس کے حالات میرے سامنے آگئے۔ جہانتک ظاہری خدوخال (خط وخال نہیں) کا تعلق ہے اس پر ایک حد تک اُن کی تصویر سے روشنی پڑتی ہے جو اس مجموعہ کیساتھ شامل ہے۔ لیکن جنھوں نے شوکت صاحب کو مختلف حالتوں میں نہیں دیکھا وہ کیا سمجھ سکتے ہیں کہ جب شوکت صاحب صرف تصویر کھنچوانے کیلئے بیٹھتے ہیں تو اُن کے چہرہ میں کتنی غیر حقیقی و مصنوعی سنجیدگیاں پیدا ہوجاتی ہیں جو یقیناً دلربائی'' کا کام تو دے سکتی ہیں لیکن "دلکشائی" سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔

شوکت صاحب ایک جوان العمر ادیب ہیں، نوجوان ہیں اس لئے نہیں کہتا کہ ان کی شادی بھی ہو چکی ہے اور وہ ایک بچہ کے باپ بھی ہیں نوجوانی کے مفہوم میں جو اچھوتا پن پایا جاتا ہے وہ اُن کے حالات پر

منطبق نہیں ہوتا، اور بعض ایسی خصوصیات کے بھی مالک ہیں جنکے متعلق یہ فیصلہ دشوار ہی کہ آیا وہ مرد کے لئے زیادہ موزوں ہیں یا عورت کے لئے بہرحال فی الجملہ اُنکی دلکشی سے انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ کیفیات صرف اسی وقت تک مؤثر ہوتی ہیں جبتک شوکت صاحب اپنے آپ کو نوجوان سمجھکر کافی طور پر بنتے رہتے ہیں اور نہ اس کے بعد مختلف اوقات میں جو بیساختہ کیفیات اُن کے چہرے سے ظاہر ہوتی ہیں وہ البتہ ایسی حقیقتیں ہیں جن کا علم ان کے مجموعہ پر تنقید کرنے والے کے لئے ضروری ہے، افسوس ہی کہ تفصیل سے کام لینے کے لئے اوراق مقدمہ بہت تنگ نظر آتے ہیں ورنہ شاید میں اپنی معلومات کو زیادہ بسط کے ساتھ بیان کرتا۔ تاہم اسقدر عرض کردینا ضروری ہی کہ شوکت صاحب ہمیشہ وہ نہیں رہتے جو اپنے مضامین میں نظر آتے ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں کہ "حقیقی شوکت صاحب" شاید وہی ہیں جب وہ خستہ و پریشان اپنے دفتر سے دوپہر کی گرمی میں گھبرائے ہوئے نسیم صاحب کی جستجو میں آتے ہیں اور یہ حضرت جو "باما شراب خورد و بزاہد نماز کرد" کی بہترین تفسیر ہیں یا تو . . . صاحب کے حجرہ میں ہوتے ہیں یا انعامی بسکٹ فیکٹری کی دوکان پر۔ اسوقت شوکت صاحب کے نتھنوں کی

کیفیت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، مدعا یہ ہے کہ شوکت صاحب کو غصہ بھی آتا ہے اور بہت کافی، وہ زود رنج بھی ہیں اور خطرناک حد تک، وہ افکار و آلام سے بھی مغلوب ہو جاتے ہیں اور پوری شدت کیساتھ۔ اس لئے میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں، کہ اُن کی مزاحیہ نگاری ہمیشہ ایک پھول کی شگفتگی ہو اور اس سے "انشراحِ زخم" کا پتہ نہیں چلایا جا سکتا۔ بات میں بات بڑھتی جا رہی ہے حکایت لذیذ نہیں لیکن دراز تر ہوتی جا رہی ہے مجھے اظہار رائے کرنا تھا اس مجموعہ کے متعلق، اور گفتگو شروع ہو گئی نفسیات مزاح نگاری پر، شوکت صاحب کی ذاتی خصوصیات پر۔ بہر حال میں اس کو یہیں قطع کر کے بتا دینا چاہتا ہوں کہ جس حد تک ایک مصنف کی خصوصیات کا اُس کی تصنیف سے تعلق ہوتا ہے، اس مجموعہ میں اس کی کافی جھلک پائی جاتی ہے گو میں یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ اس کے ہر مضمون میں وہ اپنے کو یا اپنی فطری کیفیات کو تکمیل کے ساتھ نمایاں کر سکے ہیں۔

شوکت فطرت کی طرف سے اس قسم کی حس لیکر آئے ہیں جو ہر چیز کا شیریں حصہ حاصل کر کے تلخ حصہ کو دوسروں کے لئے چھوڑ دینا پسند کرتی ہو اور اس سے قدرتاً اُن میں ایک لطیف قسم کی بے اعتنائی یا بیرحمی پیدا ہو جانا

چاہیے، چنانچہ آپ اس مجموعہ میں بعض مضامین ایسے پائیں گے جس میں یہ پُرلطف ایذا کوشی پورے طور پر نمایاں ہے۔

شوکت، ایک فطری ادیب شاعر کی طرح جزئیات کے مطالعہ کے بہت شائق ہیں، اور اُن کے اظہار پر بھی قدرت رکھتے ہیں، لیکن کھلنڈرے پن کیساتھ۔ اور یہی وہ چیز ہے جس نے انھیں "مزاح نگار" بنا دیا ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے، جو انھیں ملک کے دوسرے مزاح نگاروں سے جدا کرتی ہے۔ اس رنگ کے لکھنے والوں میں اس وقت، پطرس، رموزی، رشید اور عظیم چغتائی بہت مشہور ہیں۔ لیکن جس طرح ان میں سے ہر ایک دوسرے سے ممیز ہے اسی طرح شوکت ان سب سے علیحدہ ہیں، چغتائی صاحب کی مزاح نگاری اکثر و بیشتر منحصر ہوتی ہے پلاٹ یا واقعات پر یعنی وہ حالات ایسے پیش کرتے ہیں جو مشاہدے کے بعد یوں بھی ہر شخص کو ہنسا سکتے ہیں۔ رموزی کی مزاح نگاری منحصر ہے اس امر پر کہ وہ الفاظ یا فقروں کا استعمال اُن کے عام تبادر معنی سے ہٹ کر کرتے ہیں، رشید صاحب کی مزاح نگاری کا دور اولین فلسفیانہ مزاح نگاری کا بہترین نمونہ تھا۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ان کا دماغ زیادہ تھک گیا ہے۔ اور وہ

غور و مسائل کی کلفت میں نہ خود مبتلا ہونا چاہتے ہیں نہ کسی اور کو مبتلا کرنا
چاہتے ہیں۔ تاہم کوئی نہ کوئی سنجیدہ نتیجہ ان کی تحریر سے ضرور پیدا ہوتا
ہے۔ پطرس کی مزاح نگاری بڑی حد تک مغربی رنگ کی ہے جس میں واقعہ و
انداز بیان دونوں سے مضحک کیفیات پیدا کی جاتی ہیں لیکن نتیجہ کے
لحاظ سے ہمارے لئے یہ کہنا دشوار ہو جاتا ہے کہ اس میں واقعی کسی تلخ
حقیقت (GRIM REALITY) کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔
حالانکہ ایک مزاح نگار کا حقیقی کمال یہی ہے۔ شوکت کی مزاح نگاری
بھی اس خصوصیت سے معرا ہے اور وہ بھی سطحی طور پر اپنے موضوع سے
گزرنا چاہتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ان کے یہاں زبان کا لطف، مشاہدۂ
جزئیات اور لطافت خیال یہ سب اسقدر خوبی کیساتھ ملے ہوئے نظر آتے
ہیں کہ وہ اپنی فضا خاص پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کی مزاح نگاری ہوا کا وہ ہلکا
جھونکا ہے جو پانی کی سطح پر ننھی ننھی موجوں کا جال بچھا کر قلب و نگاہ کو فوراً اپنی
طرف متوجہ کر لیتا ہے اور پھر سطح کو ساکن چھوڑ کر گزر جاتا ہے اُن کے
یہاں کبھی کوئی ایسی طوفانی ہوا نہیں پائی جاتی جو پانی کو تہہ و بالا کر کے
بھنور پیدا کر دیتی ہے۔ ان کا مقصود ایک غم آلودہ شخص کو ہنسا دینا ہے

لیکن وہ غم کو مسرت سے بدلنا نہیں چاہتے، گو خود وہ کلفت کے برداشت کرنے کی کتنی ہی اہلیت کیوں نہ رکھتے ہوں لیکن دوسرے کی کلفت کو وہ اس کے لئے ناقابل برداشت بنا کر اپنا لطف حاصل کرنے سے دریغ نہیں کرتے، اس لئے ان کے مزاج میں تھوڑی سی جارحانہ کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے جو کسی حد تک "غیر پاکبازانہ تنقید" کہلائی جا سکتی ہے۔

میں نے شوکت صاحب کے اکثر مضامین سنجیدہ اور غیر سنجیدہ دونوں قسم کے دیکھے ہیں، اور ہمیشہ میں نے محسوس کیا کہ انکی صحافی زندگی کا مستقبل شاید انکی قوت نقد کے نشوونما میں پنہاں ہے، یعنی اگر ماحول نے اُن کو گمراہ نہ کر دیا، یا یہ کہ وہ اپنی فطرت کے خلاف کسی اور رنگ کی طرف مائل نہ ہو گئے تو اُن کو آخر کار ایک بہترین نقاد بننا ہے۔ یعنی وہ حقائق و شواہد کا مطالعہ کرنے میں اپنی ژرف نگاہی کو بڑی حد تک وسیع و عمیق بنا سکتے ہیں لیکن مفروضات پر وہ کبھی نظریۂ تنقید یا اصول کار کی بنیاد قائم نہیں کر سکتے یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ وہ مشاہدات مادی کی بنا پر کسی حقیقی واقعہ پر تنقید تو اچھی طرح کر سکتے ہیں لیکن کسی فسانہ یا رومان کی دنیا میں وہ اپنے قوائے فکر سے کام لیکر کوئی اختراعی، ابداعی یا تصوری نظریہ تنقید پیدا نہیں

کر سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ نتیجہ ہو اس حقیقت کا کہ ان کے حالاتِ زندگی میں کوئی ناگوار تغیر پیدا ہوا ہے اور وہ اس کے محو کرنے کی فکر میں ایسے مشغلہ کو جاری نہیں رکھ سکتے جو امکاناً اس ناگواری کو بڑھا دینے والا ہے یا یہ کہ فطرتاً وہ "میکانکی" قسم کا ذوقِ نشاط لیکر آئے ہیں۔

چونکہ شوکت صاحب ابھی پختہ عمر ادیب نہیں ہیں، اس لئے زمانہ کے ساتھ ساتھ ابھی اُن کے رنگ میں بہت کچھ تغیر ہونا یقینی ہے۔ میں یہ پیشین گوئی تو کر نہیں سکتا کہ وہ کسی وقت اس مخصوص رنگ سے بالکل علیحدہ ہو کر کوئی جداگانہ روش اختیار کریں گے (اور اگر انھوں نے کبھی ایسا کیا تو سخت غلطی کریں گے لیکن یہ ضروری ہے کہ یا تو اُن کی موجودہ مزاح نگاری کا معیار ادنیٰ ہو جائے گا یا اعلیٰ۔ یہ سطح قائم نہیں رہ سکتی۔ اگر انھوں نے ہر سال ایک مجموعہ شائع کرنے کا ارادہ کیا، یا محض فرمائش پوری کرنے یا ہر رسالہ میں نظر آنے کی غرض سے لکھنا شروع کیا تو یقیناً وہ حال کے معیار سے بھی نیچے آجائیں گے، لیکن اگر انھوں نے اس نکتہ کو سمجھ لیا کہ جس طرح بغیر کسی جذبۂ محبت کے غزل گوئی کوئی معنی نہیں رکھتی، اسی طرح مزاح نگاری بھی بے روح ہے اگر وہ واقعی کسی کیفیت ابتہاج کا نتیجہ نہیں تو ان کے موجودہ

رنگ کا اور زیادہ نکھر جانا یقینی ہے، لیکن میں ایک مشورہ ضرور پیش کرونگا اور وہ یہ کہ جہاں تک ممکن ہو جارحانہ پہلو سے اعتراض کریں اور ضرورت سے زیادہ "ذاتی چیز" پیش نہ کریں۔ اس کیساتھ یہ بھی عرض ہے کہ جب ان کی عمر چالیس سال سے زیادہ متجاوز ہو جائے تو وہ اس رنگ میں کبھی کبھی کچھ چھینٹیں خون کی بھی ملادیا کریں تو زیادہ مناسب ہے جس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ اپنی نقاشی کیلئے جو بیک گراؤنڈ متعین کریں وہ "تشائم وحزین" ہو۔ اس سے جو وزن اُن کی مزاح نگاری میں پیدا ہو جائے گا، وہ بہت کچھ ہمارے "سوشل مصالح" کی چیز بن جائیگا اور بڑی حد تک غیر فانی۔

مزاح و مذاق کا فلسفہ یہ ہے کہ جب اس سلسلہ میں کسی خاص شخص کا ذکر کیا جائے تو سچی بات کوئی نہ کہی جائے۔ ورنہ اس کا کسی وقت سنجیدگی میں تبدیل ہو کر "بات کا بتنگڑ" بن جانا بعید نہیں۔ نسیم صاحب لاکھ اُن کے بے تکلف دوست ہوں لیکن غالباً اُن کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ انکی "چہرہ نمائی" میں اسقدر صحت و سچائی سے کام لیتے اور خواہ مخواہ دوسروں کو یہ رشک کرنے کا موقع دیتے کہ "شوکت صاحب نسیم صاحب سے کیوں اسقدر بے تکلف ہیں"۔ اسی طرح آگرہ کے سفر کا ذکر کرتے ہوئے ساغر صاحب کے متعلق

اظہار جذبات میں وہ زیادہ بہک گئے ہیں گو اُس رشک اور اُس
"احساس لغزش" میں خود میرے جذبات کا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن یہ
کہنے کا امکان ضرور ہو کہ

ایں نشئہ بہ من نیست اگر بادہ گرے ہست

بعض بعض مضامین اس مجموعہ کے حقیقتاً شوکت صاحب کے بہت بلند
شاہکار ہیں۔ مثلاً "جس کیلئے کیا سفر"۔ "بیکاری"۔ "شوروشی عدالت" وغیرہ۔
ایک مضمون اُن کا "مثنوی میٹھے" ایسا ہے جس کو شوکت صاحب کے سوا اور کوئی
مزاح نگار یو۔پی۔ بلکہ لکھنؤ سے باہر کا نہیں لکھ سکتا۔

بہرحال ملک کو شوکت صاحب کا اور اُن سے زیادہ نسیم صاحب کا ممنون
ہونا چاہیئے کہ پے درپے دو مجموعے ایسے دلچسپ مضامین کے اُنکی وجہ سے
شائع ہو گئے۔ لیکن اسی کے ساتھ میں یہ ضرور مشورہ دوں گا کہ تیسرا مجموعہ
اب دو سال سے پہلے شائع نہ کیا جائے ورنہ [illegible] ہضم پیدا ہو جانے کا
اندیشہ ہے۔

"نیاز"

۹

(از نامہ راقم ایں اوراق)

ایک تبسم تو وہ ہے جس کے متعلق خود میں نے عرض کیا ہو عرض کیا گیا ہو بلکہ کسی کو سبق پڑھایا ہے کہ

"تبسم جب تبسم ہو کہ میں نالے کروں پیہم
تمہیں ہنسنا نہیں آتا مرے حال پریشاں پر"

اور ایک تبسم وہ ہے جس کے متعلق کسی نے کہا ہے ع

"خوش باش دمے کہ زندگانی اینست"

ان دونوں تبسموں میں اول الذکر تبسم تو دراصل مخصوص ہی اُن خوش نصیب حُسن والوں کیلئے جو اُردو شاعری کے مخاطب ہوتے ہیں اور جن کو نثر میں محبوب اور مطلوب وغیرہ کہا جاتا ہے حالانکہ اب وہ اس قسم کے تبسم کو ترک کر چکے ہیں اور یہ بداخلاقی آجکل کے فیشن ایبل محبوبوں میں بھی متروک سمجھی جاتی ہے کہ کسی کے حال پریشاں پر ہنسیں اسکی وجہ خواہ یہ ہو کہ کوئی

پریشان حال ہی نہیں ہوتا، یا یہ ہو کہ حال پریشان پر ہنسنے والے نہیں ہیں یا
لہذا پریشانی اس درجہ پر نہیں پہنچتی کہ کوئی ہنسے، بہرحال اب اس قسم کا وادامیں
سننے میں نہیں آتیں رہ گیا دوسرے قسم کا تبسم اُس کا تعلق ان بندگان خدا
سے ہی جن پر موسم کے تغیرات کا، زمانہ کے انقلابات کا اور بڑے سے بڑے
حادثہ کا کوئی اثر کبھی نہیں ہوتا، اور جو اپنی اس غیر انسانی خصوصیت کے اعتبار
سے "حضرات چہ غم" کہلاتے ہیں حالانکہ یہ واقعہ ہو کہ اس دُنیا میں اُن سے
زیادہ کامیاب زندگی کوئی بسر نہیں کرسکتا۔ بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو
اس چکنے گھڑے کی طرح بنا لیتے ہیں جس پر بوند پڑی اور پھسل گئی، عجیب
قسم کی "افکار پروف" ذہنیت ہو جاتی ہے مگر اس کا نتیجہ بھی یہ ہوتا ہے
کہ ماشاراللہ صحت کے اعتبار سے ہاتھی کے بچے معلوم ہوتے ہیں اور ہم
ان کے مقابلہ میں بالکل مدقوق۔ ہم ان کی زندگی کو رشک کے مارے
بیحیائی کی زندگی کہتے ہیں لیکن انھوں نے اپنا مقصد زندگی یہی سمجھا ہی
کہ دنیا کو قہقہوں پر اڑاتے ہیں اور ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن
ہمارا تبسم تمام دنیا سے نرالا ہے بس یہ سمجھ لیجیے کہ بقول غالب مرحوم ؎

سوزش باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں دل محیط گریہ و لب آشنائے خندہ ہی

"یہ تبسم واقعی عجیب قسم کا تبسم ہے کہ خود چاہے عمر بھر ہنسا نصیب نہ ہوا ہو لیکن دنیا کو ہنسانے کی فکر سے کبھی غافل نہ رہے۔ ہم پر حادثات بھی گزرے ہیں اور سانحات بھی۔ ہم مغموم بھی رہے اور رنجور بھی ہم پر مصیبتیں بھی گزریں اور تکلیفیں بھی، لیکن ہم سے کبھی مصورِ غم علامہ راشد الخیری نہیں بنا گیا۔ یہ چند ابتسامات پریشاں جو "بحر تبسم" کی شکل میں آپ کے پیش نظر ہیں۔ اگر ان کو پڑھ کر کوئی ہنس دے تو گویا ہم کامیاب ہو گئے، ورنہ منجملہ اور ناکامیوں کے ایک ناکامی یہ بھی سہی۔ البتہ یہ ضرور ہو گا کہ اب تک اپنے ہنسنے کے پیچھے کوئی ہم سے یہ نہیں پوچھتا تھا کہ کیوں روتے ہو اور اس صورت میں سب ہم سے رونے کی وجہ پوچھیں گے اور ہم کو کہنا ہی پڑے گا کہ صورت ہی ایسی ہے، ورنہ قصہ صرف اتنا ہے کہ "موج تبسم" کے بعد "بحر تبسم" کی اشاعت کے متعلق مرزا غالب مرحوم ہم سے پہلے کہہ گئے ہیں

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب

آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

ممکن ہے کہ ہمارا خیال صحیح ہو اور ان اوراق کو پڑھنے والے واقعی

ہنسیں۔ ایسی صورت میں صرف اس قدر التجا ہے کہ اپنے ہنسانے والے کو نہ بھول جائیے گا اور دعا کیجئے گا کہ اس کو بھی ہنسنا نصیب ہو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اُن نسیم انہونوی صاحب کے لئے دعائے تبسم فرمائیگا جنھوں نے یہ ہنسنے کا سامان آپ تک پہونچایا ہے۔

شوکت تھانوی

میز
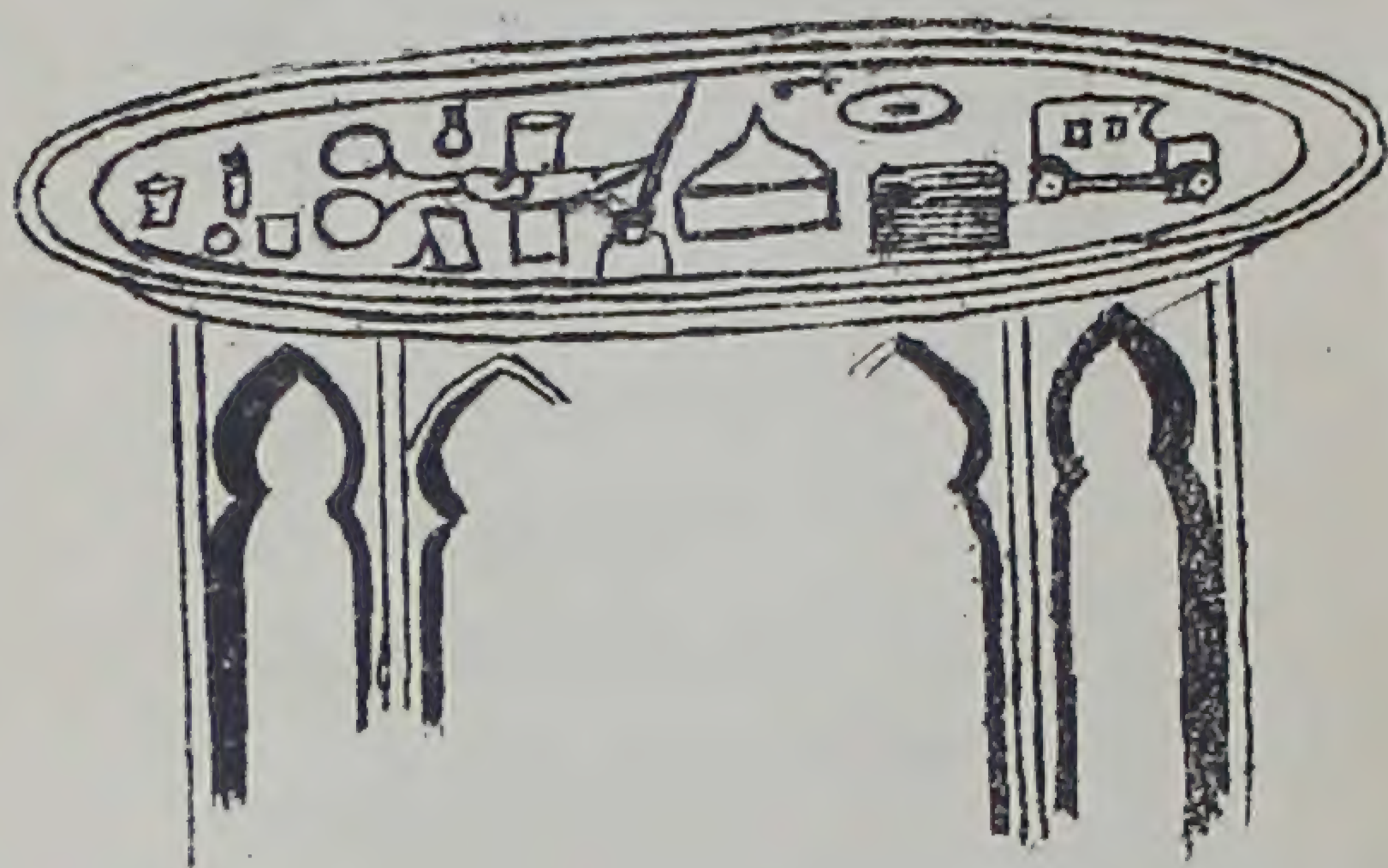
خدابخشے علامہ شبلی کہا کرتے تھے کہ ولایت والوں سے ہندوستانیوں نے صرف دو ہی چیزیں حاصل کی ہیں ایک برف دوسری میز۔ خیر برف کے متعلق تو ہماری رائے یہ ہے کہ اگر اس نعمت کو ولایت والے ہم سے واپس لے لیں تو انکی عنایت ہوگی۔ رہ گئی میز، اسکے دراصل ہم بھی معتقد ہیں اور اس اعتقاد کی وجہ صرف یہ ہے کہ اب تو خیر میز گویا زندگی کا ٹھیکرا ہے مگر اس ذمہ دارانہ زندگی سے قبل بھی میز کے اور ہمارے تعلقات بہت وسیع رہے ہیں۔ گھریلو زندگی سے لیکر اسکولی زندگی تک بس یہ سمجھ لیجیے کہ میز ہی میز تھی، اور تادم تحریر اسی میز کا سلسلہ جاری ہے تو اب آپ ہی سمجھ لیجیے کہ ان دیرینہ تعلقات کے ہوتے ہوئے ہم میز کے کیونکر نہ معتقد ہوں اور اسکو اپنی ضروریات زندگی میں ایک اہم درجہ کیونکر نہ دیں۔

انگریزوں کے یہاں یا ہندوستانی صاحب لوگوں کے یہاں تو آپ کو اس کثرت سے مختلف اقسام کی میزیں نظر آئیں گی کہ آپ حیران رہ جائیں۔ لکھنے کی میز الگ ہوگی، کھانے کی میز الگ، تاش کھیلنے کی الگ، سگریٹ پینے کی الگ، حجامت کی الگ، منہ ہاتھ دھونے کی الگ، سنگار کی الگ، گراموفون کی الگ۔ مختصر یہ کہ سیکڑوں کاموں کے لیے سیکڑوں میزیں آپ کو علیحدہ علیحدہ نظر آئینگی۔ کسی میز پر صرف ایک تصویر رکھی ہوئی ملے گی تو کسی میز پر صرف سگریٹ کی راکھ احتیاط سے رکھنے والا برتن۔ کوئی میز چینی اور شیشے کے برتنوں سے لدی ہوئی نظر آئیگی۔ تو کوئی میز مکمل ہندوستانی دواخانہ ہوگی۔ کسی میز پر صرف پانیر رکھا ہوگا تو کسی پر صرف ایک بڑا سا گھونگا۔ غرض تو کیا کہ بس قدم قدم پہ میز ہی میز ملیگی لیکن یہ صرف اُن دو تخانوں میں ممکن ہے جہاں روپیہ کی بارش ہر موسم میں ہوتی ہے اور مغربی تقلید کے جوش میں صاحب خانہ یہ قسم کھا چکے ہیں کہ اگر انگریز کے مکان میں دس میزیں ہوتی ہیں تو ہم بیس سے کم نہ رکھیں گے۔ رہ گئے ہمارے ایسے "علم قرار داد یوالیہ کی ضمن میں آنے والے مغز زین۔ میز اُنکے یہاں بھی ہوتی ہے۔ مگر

اس طرح ہوتی ہے کہ پچاس کاموں کے لیے ایک میز یعنی اسی میز پر لکھنے پڑھنے کا سامان رکھا ہوا ہے اور میز ہمارے اسی کام میں آ رہی ہے کہ عین اُسی وقت اندر سے کھانا آگیا۔ اب ہم جلدی جلدی کاغذ، قلم، دوات، کتاب، بلاٹنگ وغیرہ وغیرہ کو ایک طرف سمیٹ کر یا میز پر سے اُٹھا کر بستر پر رکھ کر میز خالی کر دینگے اور نہایت باقاعدگی سے اسی میز پر کھانا چُن دیا جائیگا۔ تبھیے یہ کھانے کی میز بن گئی۔ کھانے کے بعد دل چاہا تو اسی پر پاندان رکھ کر تنبولی کی دوکان کھول لی، پاندان اُٹھایا یا اسی کے کسی گوشہ میں رکھ کر آئینہ، داڑھی بنانے کا صابن، اُسترا، بُرش وغیرہ لیکر بیٹھ گئے اور دستِ خود دہان خود کے اصول پر چلتے ہوے اپنی داڑھی خود ہی صاف کر دی۔ مختصر یہ کہ جب تک وہ میز ہمارے سامنے ہے جس قدر بھی کام ہم کو پڑینگے سب اسی میز سے پورے کیے جائینگے۔ چنانچہ آج ہم محض آپ کو سمجھانے کے لیے اور یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ہماری میز کس پایہ کی ہے اپنی میز صاف کرتے ہیں تاکہ آپ بخوبی اندازہ کر سکیں کہ میز کثرت استعمال سے کیا ہو جاتی ہے۔

یہ میز خاص ہماری میز ہے جو ہمارے پلنگ سے ملی ہوئی کمرہ کے

ایک کونے میں محض اس لیے رکھی ہوئی ہے کہ اگر ہم لکھتے لکھتے اتفاقاً کبھی
اونگھ جائیں تو صبح اپنے کو بستر ہی پر پائیں، یا اگر کبھی کبھی سوتے آنکھ کھل جائے
اور کچھ لکھنے کو دل چاہے تو چارپائی پر بیٹھے بیٹھے میز کی مدد سے ہم اپنا یہ حوصلہ
بھی پورا کر لیں۔ اس میز کے متعلق ہمارا قطعی حکم یہ ہے کہ اسکو کوئی کبھی نہ
چھوئے۔ چنانچہ اس میز کے قریب بھی کوئی نہیں جاتا اور یہی وجہ ہے
کہ ہمکو ضرورت کے وقت اپنی ضرورت کی تمام چیزیں اسی میز پر مل جاتی
ہیں۔ بہرحال آج ہم محض آپ کی خاطر اپنی میز صاف کرتے ہیں اور ایک
ایک چیز اُٹھاتے ہیں تاکہ آپ ہماری اس میز کے مرتبہ سے آگاہ ہو جائیں۔

پہلی چیز جو ہم اپنی میز پر سے اُٹھا کر بستر پر رکھتے ہیں وہ پانوں کی
ڈبیہ ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ پانوں کی ڈبیہ ایک اہل قلم کے واسطے
قلم سے کم ضروری نہیں ہے۔ بات یہ ہے قلم تو وہی الفاظ کاغذ پر لکھے گا
جو دماغ میں آئیں۔ مگر ایک اہل قلم کا دماغ اس وقت تک کام ہی نہیں
دے سکتا جب تک کہ اُسکا منہ پان چبانے کے لیے نہ چلے۔ دوسری
چیز بٹوہ ہے۔ اس میں ڈلی، تمباکو اور الائچی وغیرہ ہے۔ غالباً یہ بتانے کی
ضرورت نہیں کہ بغیر ان لوازم کے پان نہیں کھایا جاتا۔ یہ دیکھیے لیمپ ہی

اور یہ شخص اس لیے میز پر رہتا ہے کہ جب رات کو لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اس ضرورت کو بغیر اس لیمپ کے پورا نہیں کیا جا سکتا ہے لہذا بنظر احتیاط ولن کو ہم اس لیمپ کو میز پر سے نہیں ہٹاتے کہ اگر اس کو ہٹایا تو یہ غائب ہو جائیگا - یہ ایک موزہ ہے اسکی جوڑ کا دوسرا موزہ عرصہ سے غائب ہے - لہذا اس کو ہم نے صرف اس لیے میز پر رہنے دیا ہے کہ ممکن ہے وہ مل جائے ورنہ یہ بھی کھو جاتا اور اسکے کھونے کے بعد کھوئے ہوئے موزے کا ملنا بھی بیکار ہوتا - دیکھیے یہ بظاہر ایک میلا سا کپڑا ہے مگر ہے بہت مفید - اس سے لیمپ کی چمنی بھی صاف کرلی جاتی ہے ، اگر میز پر گرد وغبار ہو تو اس کپڑے کو کام میں لایا جا سکتا ہے - فاؤنٹین پن میں روشنائی بھرنے کے بعد اسی کپڑے سے تب صاف کیا جاتا ہے - مختصر یہ کہ یہ بہت مفید چیز ہے - یہ سوڈے کی بوتل کا ربڑ والا چھلا ہے اور اس کو ہم نے اس وقت کے لیے محفوظ رہنے دیا ہے کہ فرض کر لیجیے ہم لکھ رہے ہیں پورے انہماک کے ساتھ اور کوئی بچہ کسی بات پر مچل گیا اور لگا اس طرح رونے کہ ہم ایک لفظ بھی آگے نہ لکھ سکیں اُس وقت یہ چھلا دیکر اسکو بہلایا جا سکیگا - یہ ہے ٹائمز آف انڈیا کا

ہفتہ وار ایڈیشن ہے تو بہت پرانا مگر اس میں تصویریں بہت عمدہ عمدہ
ہیں جن کو ہم فریم کرانے کے متعلق مسلسل دو سال سے غور کر رہے
ہیں۔ یہ لیجیے بیگم صاحب نے اس کے لیے کئی بیاں بانس ڈلوا دیئے
اور گھر کا گوشہ گوشہ چھان مارا مگر کہیں نہ ملا۔ یہ پاندان کا ڈھکنا غالباً
اُس روز میز پر آیا تھا جب ہم پانوں کی ڈبیہ دفتر میں بھول آئے تھے،
وہ تو کہیے کہ میز کی وجہ سے محفوظ بھی رہ گیا ورنہ یہ بھلا ملتا۔ کہیں یہ سینما
کا اشتہار ہے۔ اچھا ایک بات تو ہے کہ اگر آج سینما والے یہ اعلان کر دیں
کہ ایک ہزار روپیہ اس شخص کو انعام دیا جائیگا جو ہمارے سینما کا سب سے پرانا
اشتہار پیش کرے۔ تو یہ انعام ہم ہی کو مل سکتا ہے۔ خدا جانے یہ اشتہار
کیونکر رہ گیا یعنی پانچ سال کا پرانا اشتہار ہے۔ اس عرصہ میں ہم نے
دو ایک مرتبہ تو ضرور میز صاف کی ہوگی مگر یہ ہمیشہ اسی میز پر رہا۔ خیر یہ
اب تک رہا ہے تو اب بھی رہیگا۔ یہ ایک رسالہ ہے جسکے ایڈیٹر صاحب سے
ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ہم مضمون ضرور بھیجیں گے مگر بھول گئے، اب تو یہ
رسالہ بھی بند ہو گیا مگر اس رسالہ کی میز پر موجودگی اس لیے ضروری ہے
تاکہ کسی اور رسالہ سے وعدہ کرنے کے بعد ہم نہ بھولیں۔ یہ دیکھیے یہ بچوں کے

کھیلنے کا موٹر ہے اس میں کوک بھر دیجیے اور چھوڑ دیجیے تو خود بخود چلتا ہے،
ایک مرتبہ صاحبزادے نے اسکو توڑ ڈالا تھا تو ہم نے بمشکل تمام اسکی
مرمت کی اور اس دن سے اسکو اپنے ہی پاس رکھ لیا ہے تاکہ بچے
خراب نہ کریں۔ یہ کنجی کیسی؟ ہاں خوب یاد آیا یہ کنجی بیگم صاحبہ نے
پھینک دی تھی تو ہم نے چپکے سے اُٹھا کر رکھ لی تھی کہ جب وہ ڈھونڈھینگی
تو ہم انکی اس لاپروائی پر اُن کو سبق دیتے ہوے کنجی دیدینگے۔ مگر عجیب
اتفاق کی بات ہے کہ اُنھوں نے ہم سے آج تک ذکر ہی نہیں کیا،
خیر داشتہ آید بکار، رہنے دیں اسکو پھر دیکھا جائیگا۔ یہ خط ہے کسی کا
اور عرصہ سے محض اس لیے رکھا ہوا ہے کہ شاید ہم کو یاد آجائے کہ ہم نے
اسکو کیوں رکھا تھا۔ مگر اب تک یاد ہی نہیں آیا۔ یہ مس سلوچنا کی تصویر
ہے۔ افسوس ہے کہ اس احتیاط کے باوجود اس پر تیل کا دھبہ خدا جانے
کہاں سے پڑ گیا ورنہ یہ تو اس قابل تصویر تھی کہ اسکو شیشے میں جڑوا کر
لگایا جاتا اور یہی خیال بھی تھا ہمارا مگر خراب تو یوں ہی رہیگی یہ بات ہے
اس تیل کی کپی کی وجہ سے یہ تصویر خراب ہوئی ہے۔ لاحول ولا قوۃ،
اُس روز جب بچے کے موٹر کی مرمت کی ہے تو اس کپی سے موٹر میں تیل دیا تھا

اُسی روز سے یہ یہاں پڑی ہے مگر اب تو اسکا سب تیل ہی گر گیا ہے۔
اب اسکے رہنے میں کیا مضائقہ ہے۔ یہ ایک ڈکشنری ہے اور بہت
قیمتی ڈکشنری ہے۔ خصوصاً ٹائمز آف انڈیا کے معمے حل کرنے میں تو
اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔ افسوس کہ اس پر بھی تھوڑا سا تیل پڑ گیا۔
وہ تو کہیے کہ صرف جلد خراب ہوئی ورنہ کتاب ہی غارت ہو جاتی۔ یہ بیچے
یہ سروتا یہاں رکھا ہے جسکے متعلق تلاش سے تھک جانے کے بعد بیگم صاحبہ
کا قطعی خیال یہ تھا کہ یہ نہ ہو دھوبن چرا لے گئی ہے اور اُنکا یہ خیال
غلط نہیں تھا بلکہ واقعہ بھی یہی ہے کہ اگر یہ سروتا ہماری میز پر احتیاط سے
نہ رکھا ہوتا تو یقیناً دھوبن کے یہاں ہوتا وہ ضرور چرا لے جاتی اور اب
بھی اگر ہم نے اس کو میز پر سے ہٹایا تو یہ چوری جائیگا۔ یہ دیا سلائی کی
ایک خالی ڈبیہ ہے۔ بظاہر تو یہ ایک بیکار سی چیز ہے، لیکن اگر آپ کو
آج ہی کوئی انگوٹھی اپنے کسی عزیز یا دوست کے نام بذریعۂ پارسل بھیجنا
پڑے تو یہی بیکار سی چیز اس قدر کار آمد ثابت ہوگی کہ آپ واقعی خوش
ہو جائینگے، آپ کہیں گے کہ یہ لکڑی خواہ مخواہ میز پر کیوں رکھی گئی ہے مگر سنئے یہ خواہ مخواہ
نہیں رکھی گئی ہے، بلکہ ہمیشہ ہوتا یہ تھا کہ پاجامہ میں ازار بند ڈالنے کے لئے اگر قلم استعمال

کیا گیا تو اسکی نب مجروح ہوگئی، اور پنسل استعمال کی گئی تو ٹوٹ گئی۔ اس مستقل بدتمیزی اور نقصان سے بچنے کے لیے ہم نے یہ لکڑی لاکر رکھی ہے اب آپ ہی کہیں گے کہ یہ کس قدر ضروری چیز ہے۔ یہ خط لکھنے کے کاغذ کا پیڈ ہے، یہ لفافوں کا ڈبہ ہے، یہ ایک دوات ہے۔ حالانکہ اس میں روشنائی نہیں ہے لیکن اگر آپ ذرا سا پانی اس میں ڈال دیں اور دو منٹ اس دوات کو ہلائیں تو خدا کی ذات سے امید ہے کہ آپ کو نہایت خوش رنگ روشنائی تیار ملیگی، بات یہ ہو کہ اسکی روشنائی خشک ہوگئی ہے۔ یہ اونی کپڑوں کے نمونوں کی کتاب ہے جو لال املی سے آئی تھی۔ اس میں عجیب عجیب ڈیزائن کے کپڑے ہیں۔ چنانچہ جس دن ہم کو کپڑا خریدنا ہوتا ہے ایک دن پہلے سے ہم اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر ہم کو کپڑے کی خریداری میں بہت سی آسانیاں محض اس نمونوں کی کتاب کی وجہ سے حاصل ہو جاتی ہیں۔ یہ بائسکل کا لیمپ ہے ہمکو اس کا اعتراف ہے کہ میز پر اسکا کوئی تک نہیں۔ مگر یہ تو خیال فرمائیے کہ اگر ہم اسکو میز کے علاوہ کہیں اور رکھیں تو صاحبزادگان بلند اقبال عرصہ سے اس تاک میں ہیں کہ ان میں سے ایک بجز ریلوے انجن کا ڈرائیور۔ اور

ایک گارڈ بن کر اسی سائیکل کے لیمپ کو گارڈ کی لالٹین بنا کر بلائے۔ مختصر یہ کہ ہماری سائیکل بے لیمپ کی ہو جائے۔ اس لیے کہ اس کھیل کے بعد اسکا ٹوٹ جانا برحق ہے تو جناب اسکو ہم اسی لیے میز پر رکھتے ہیں۔ یہ ملاحظہ فرمائیے دیوان غالب ہے۔ غالباً اس کی موجودگی ہماری خوش مذاقی کی ایک روشن دلیل ہے۔ ہم کبھی کبھی جب موسم خراب ہوتا ہے یعنی بارش وارش ہونے لگتی ہے یا ہمکو بخار و خار ہو جاتا ہے تو اس کو چارپائی پر لیٹ کر پڑھتے ہیں۔ یہ ویسٹ اینڈ واچ کمپنی کی فہرست ہے اسمیں گھڑیوں کی تصویریں دیکھکر بچے خوش ہوتے ہیں۔ یہ اخبار "سچ ویکلی" کا فائل ہے۔ اس کے متعلق ہماری سخت ہدایت یہ ہے کہ یہ دوسری تمام چیزوں سے زیادہ احتیاط سے رہے۔ اور دوسرے اخبارات کے ساتھ ردی میں بیچا نہ جائے۔ اس لیے کہ اسکے متعلق ہمارا مصمم ارادہ یہ ہے کہ اسکے فائل کی جلد بندھوائیں گے۔ افسوس اس غیاث اللغات کو چوہوں نے کاٹ ڈالا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری میز پر بھی چوہے آنے لگے ہیں۔ اور اب مجبوراً ہم کو میز پر چوہے دان بھی رکھنا پڑیگا۔ ورنہ سب چیزیں یہ چوہے تناول فرما جائیں گے۔

یہ رسالہ "آئینہ" ہے۔ دہلی سے نکلتا تھا، بہت اچھا رسالہ تھا، اب عرصے سے نہیں نکلا ہے۔ ہم نے اس کو نہایت احتیاط سے محض اس لیے رہنے دیا ہے کہ اس آئینہ میں ہم اپنی خود غرضی کا چہرہ دیکھ سکیں۔ اس بیچارے نے دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات کی بنا پر ہم سے بارہا مضمون طلب کیا، مگر ہم نے اجرتی مضامین کے پیچھے اسکی پروا نہیں کی، افسوس ہمارے حال پر۔ یہ کنین کی گولیاں ہیں اور یہ امرت دھارا، ہماری آخری وصیت اپنی اولاد سے یہ ہو گی کہ ان دونوں چیزوں کو بلکہ ٹنچر آئیڈین کو بھی ہمیشہ اپنی اپنی میز پر رکھا کریں۔ یہ داڑھی بنانے کے لیے پانی رکھنے والی کٹوری ہے جو حضرات داڑھی بناتے رہتے ہیں وہ اسکی اہمیت کو خوب سمجھتے ہونگے۔ یہ قینچی ہے اور یہ ہمارا پرانا بٹوہ ہے اس کو محض اس لیے رہنے دیا ہے کہ اگر نیا بٹوہ کھو جائے تو اسی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ بائیسکل کا پمپ ہے اس سے ہم دو کام لیتے ہیں، ہوا بھی بھرتے ہیں اور دل کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ اگر میز پر سے اسکو بچے اٹھا لیجائیں تو ایک دوسرے کے منہ میں ہوا بھرنے کے کام میں لا کر اسکے یہ دونوں مفید کام ختم کرا دیں۔ اب میز پر صرف دو چیزیں رہ گئی ہیں۔ ایک

قلمدان جسمیں علاوہ قلم، پنسل، ربڑ وغیرہ کے سوئی اور تاگہ بھی ہے
اور دوسری چیز ہمارا آفس بکس ہے جسمیں آگے سے تو تالا پڑا ہوا ہے
اور کنجی کھو گئی ہے پیچھے سے قبضے ٹوٹ جانے کی وجہ سے نہایت آسانی
سے کھل جاتا ہے۔ اسمیں بہت سی ضروری چیزیں از قسم اقرارنامے،
بیعنامے، کچھ تصاویر، ہمارا خاندانی شجرہ، لائف انشورنس کمپنی کے کاغذات
وغیرہ وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔

میز کا سامان تو ختم ہو گیا اور باقی رہ گئی گرد وہ بھی جھاڑے دیتے ہیں ٹیبل کلاتھ
کے نیچے بہت سے کاغذات رکھے ہوئے ہیں جو ایسے ضروری ہیں کہ ہم انکو چھیڑنا نہیں چاہتے
اسکے بعد میز کے اس گوشہ میں جو دیوار کی طرف ہے مکڑی نے جالا تان رکھا ہے۔ ہم
چاہیں تو اس جالے کو صاف کر سکتے ہیں مگر آپ ہی بتائیے کہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ گویا ہم
اپنی صفائی کے لیے اس بے زبان مخلوق کا گھر تباہ کر رہے ہیں۔ اگر بجائے ہمارے
وہ اشرف المخلوقات میں سے ہوتی تو خدا جانے ہمارا کیا حشر ہوتا۔ ہم اس غریب
کی بددعا سننے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اسکو یوں ہی رہنے دیتے ہیں۔ بہرحال خدا
آپ حضرات کا بھلا کرے کہ آج آپکے طفیل ہماری میز ایک عرصہ کے بعد صاف کی گئی ہے۔
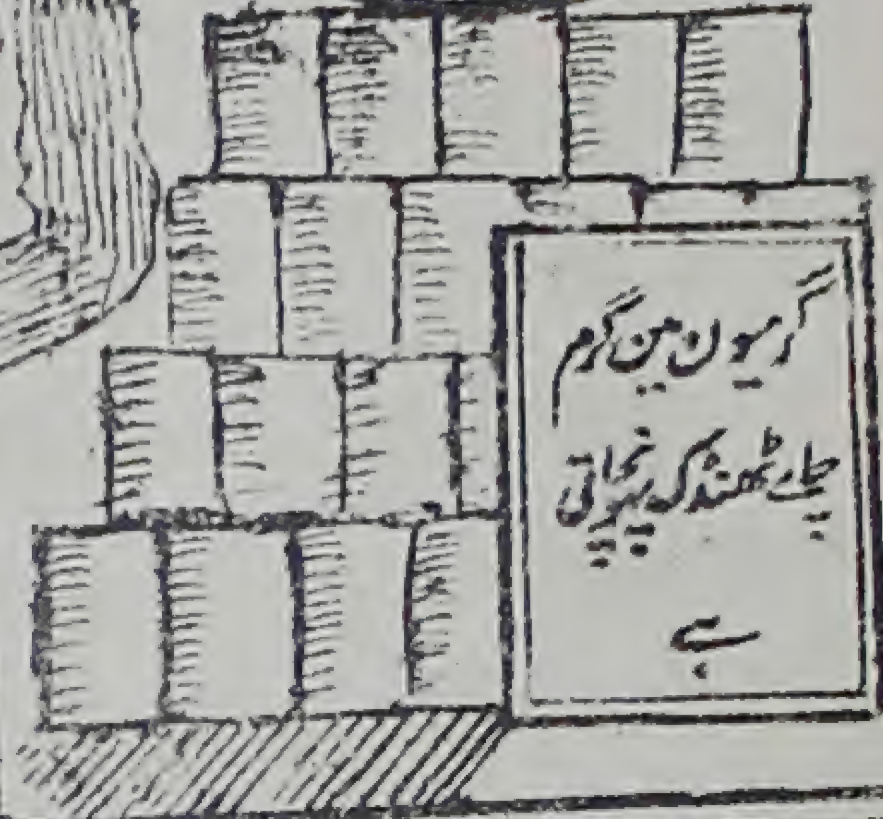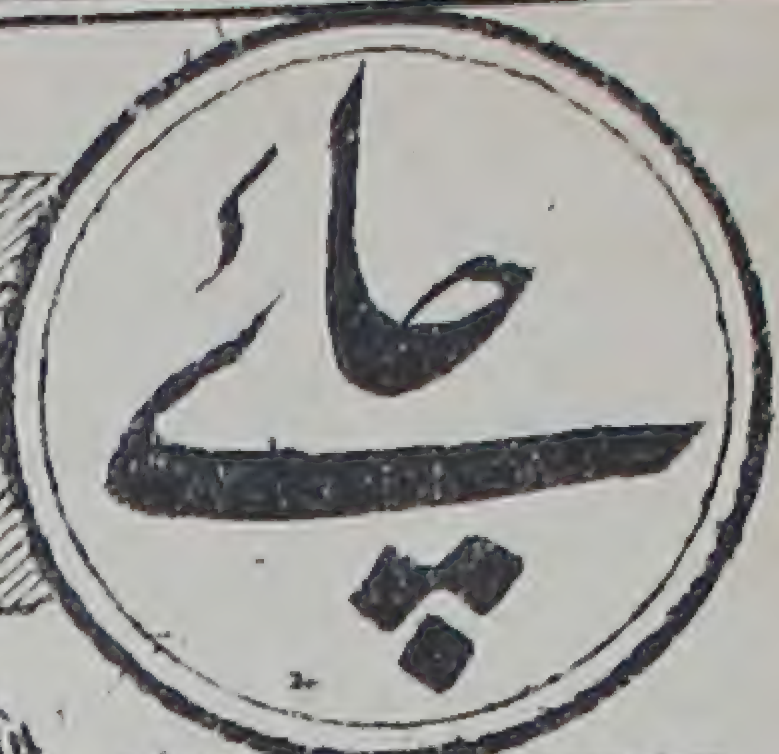
چاے
گرمیوں میں گرم
چاے ٹھنڈک پہنچاتی
ہے

چائے

یہاں اُن بدمذاقوں کا ذکر نہیں ہے جو چائے سے اس طرح
گھبراتے ہیں جس طرح بھیڑ یا بارش سے یا ہم بھیڑیے سے، اور نہ اُن
موسمی انسانوں سے بحث ہے جو جاڑے کے دنوں میں تو خیر چیسٹر یا اورکوٹ
سمجھ کر چائے پی لیتے ہیں لیکن گرمی شروع ہوتے ہی چائے ایسی چھوڑتے
ہیں گویا کبھی پی ہی نہ تھی، حالانکہ تمام ہندوستان کے ہوٹلوں سے
لیکر اسٹیشنوں تک بخط جلی یہ عبارت لکھی ہوئی ہے کہ "گرم چائے گرمیوں
میں ٹھنڈک پہنچاتا ہے" لیکن سچ پوچھیے تو یہ لوگ چائے کو چائے
سمجھ کر کبھی پیتے ہی نہیں ورنہ چائے ایک مرتبہ پینے کے بعد کوئی
بھلا چھوڑ سکے؟ توبہ کیجیے۔ ع

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

ان لوگوں کو تو اگر کیتھا گھلے ہوئے گرم پانی میں تھوڑا سا دودھ اور تھوڑی سی شکر ملا کر دیدی جائے تو واللہ ان کو تمیز نہ ہو گی کہ کیا نوش فرما رہے ہیں ایسے "چائے ناشناس" انسانوں کو چائے پلانا چائے کی توہین کرنا اور لپٹن کمپنی لمیٹڈ کی قسمت پھوڑنا ہے۔ ان لوگوں سے وہ بیچارے بدرجہا غنیمت ہیں جنھوں نے اس ڈر کے مارے اب تک چائے نہیں پی ہے کہ شاید اس میں سنکھیا کا جزو ہوتا ہے اور اگر خلاف عادت چائے پی لی جائے تو موت بھی واقع ہو سکتی ہے خیر ان لوگوں کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ع

"چائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں"

لیکن واللہ کمال کرتے ہیں وہ لوگ جو ایک مرتبہ چائے پی لینے کے بعد پھر اسکو چھوڑ سکنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں اور انکی چائے نوشی بھی موسمی ہوتی ہے۔ کم از کم ہمارا تو یہ حال ہے کہ ہمکو پہلی مرتبہ چائے پینا یاد نہیں ہے اور نہ کسی مرتبہ چائے کا چھوڑنا یاد آتا ہے بس اتنا یاد ہے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد سے جس طرح اپنے آپ کو برابر کھانا کھاتے ہوئے اور برابر پانی پیتے ہوئے دیکھتے چلے آئے ہیں۔ اسی طرح چائے

بھی جاری ہے ایسا اتفاق تو خیر بارہا ہوا ہے کہ کسی وقت کھانا نہ کھایا اور طبیعت ہلکی رکھنے کے لیے فاقہ کر ڈالا لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا ہے کہ ایک وقت بھی چائے چھوٹی ہو۔ اور نہ یہ کوئی آسان کام تھا۔ بارہا ہم کو بہت سے ناصح مشفق قسم کے لوگوں نے سمجھایا کہ چائے سے خشکی ہوتی ہے، چائے سے اختلاج ہوتا ہے، چائے سے نیند خراب جاتی ہے۔ چائے سے مثانہ کمزور ہوتا ہے اور چائے سے یہ ہو جاتا ہے اور چائے سے وہ ہو جاتا ہے۔ لیکن ہم نے بھی اس بادہ خوار کی طرح جو زاہدوں کے واعظ کو بکواس سمجھتا ہے کبھی ان دھمکیوں کا کوئی اثر نہ لیا اور اثر نہ لینے پر مجبور بھی تھے، یہ تو خیر معمولی باتیں تھیں لیکن اگر ہم کو یہ بھی یقین دلایا جاتا کہ چائے پینے سے طاعون ہو جاتا ہے یا چائے پینے سے کالرہ یقینی ہے یا چائے پینے سے دق کا تیسرا درجہ فوراً شروع ہو جاتا ہے تو بھی ہم چائے ترک کرنے سے تو معذور ہی تھے۔ اور ہم ہی پر کیا منحصر ہے ہم نے تو جتنے بھی اُن چائے کے پینے والوں کو دیکھا ہے، جو صحیح معنوں میں چائے نوش ہیں۔ سب کا یہی حال پایا کہ اس لپٹن کمپنی والی کے مُرید ہو کر رہ گئے ہیں۔ بلکہ جس طرح آغا حشر صاحب کاشمیری نے

بادہ خواروں کے متعلق فرمایا ہے کہ ؎

گلاسوں میں جو ڈوبے پھر نہ نکلے زندگانی میں
ہزاروں بہہ گئے ان بوتلوں کے بند پانی میں

اسی طرح ہم چائے خواروں کے متعلق عرض کرینگے کہ ؎

جو ڈوبے پرچ پیالی میں نہ نکلے زندگانی میں
ہزاروں بہہ گئے اس کیتلی کے گرم پانی میں

سچ تو یہ ہے کہ ہم میں اور میخواروں میں سوائے اسکے اور فرق ہی کیا ہے کہ وہ ایک حرام شراب پیتے ہیں اور ہم حلال شراب بلکہ ہمارا تو خیال ہے کہ جس شراب کا نام بادۂ کوثر ہے وہ شاید یہی شراب ہے جسکو ہم سب چائے کہتے ہیں۔ اگر یہ خیال غلط بھی ہے تو وہ بادۂ کوثر یقیناً چائے سے ملتی جلتی کوئی چیز ہوگی اور نہ بھی ہو تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ چائے ہماری شراب ہے اور اللہ میاں نے اسکو حرام نہیں کیا ہے۔ لوگ اسکی یہ وجہ بھی بیان کر سکتے ہیں کہ چونکہ چائے حال ہی کی ایجاد ہے اس لیے اسکو حرام نہیں کیا جا سکا۔ بہر حال ہمکو اس سے کوئی مطلب نہیں ہم تو ایک ایسی چیز کو اپنی شراب بنائے ہوئے ہیں

جو شراب ہے لیکن حرام نہیں اور اسکو پینے کے بعد بھی ہمارا یہ حال ہے کہ
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

چائے جو سچ مچ کی چائے ہے وہ تو ایک ہی ہے یہ اور بات ہے کہ مشرقی اچھوائی پینے والوں نے چائے کی بھی متعدد قسمیں پیدا کر دی ہیں۔ ہری چائے، کشمیری چائے۔ دیسی چائے اور انگریزی چائے وغیرہ اور انھیں اقسام کی بنا پر چائے کی متعدد خصوصیات بھی قرار دے دی گئی ہیں۔ مثلاً چائے کی خصوصیات میں سے یہ فارسی قسم کی خصوصیتیں ہیں کہ چائے لب بند، لب ریز، لب سوز، ہو لیکن کشمیری چائے میں یہ تین صفات ایک کے اضافہ کے بعد چار ہو جاتی ہیں یعنی لب بند، لب ریز، لب سوز، اور لب دھر، کہ اُس کو بالائی کے ملغوبے سے خدا جانے کیا بنا دیا جاتا ہے۔ وہ چائے کیا ہوتی ہے ایک قسم کا میٹھا سالن ہوتا ہے جس میں سیکڑوں قسم کے تو مسالے ڈالے جاتے ہیں اور جوش اس قدر دیا جاتا ہے کہ گویا شب دیگ تیار ہو رہی ہے۔ شیرینی کا یہ حال ہوتا ہے کہ گویا امرتیوں کا قوام ڈالا گیا ہے۔ اور ان ترکیبوں سے تیار ہو کر جو چیز بنتی ہے اس پر وہ لوگ چائے کی تہمت لگاتے ہیں اور اسی کی

یہ خصوصیات قرار دی گئی ہیں کہ لب ریز، لب بند، لب سوز ہو لیکن ہماری خاطر سے ایک خصوصیت کا اور اضافہ کر لیا جائے کہ لب دوز ہو لیکن یہ چائے اگر کسی حقیقی چائے نوش کو پلا دی جائے تو وہ ناک بھوں چڑھا کر فوراً حضرت ریاض کا شعر اس طرح پڑھیگا۔

اربے بیرا ذرا لپٹن کی چائے دم تو کر لانا
یہ دیسی چائے بالکل انگیٹھی معلوم ہوتی ہے

اسکو تو خیر ہم نے میٹھا سالن عرض کیا ہے لیکن لوگ چائے کو سچ مچ سالن بنا کر استعمال کرتے ہیں یعنی نمکین چائے پیتے ہیں اور اس نمکین چائے کو جس وقت شیرمال ڈال کر پیتے نہیں بلکہ کھاتے ہیں اُس وقت بالکل یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیرمال نہاری سے کھائی جا رہی ہے اور واقعی وہ لوگ چائے کو نہاری کا بدل سمجھتے ہیں ورنہ کہاں چائے کہاں اس میں نمک اور کہاں شیرمال سے اسکو کھانا۔ ہم کو تعجب ہے کہ یہ لوگ چائے میں گوشت ڈال کر باقاعدہ چائے کا سالن کیوں نہیں پکاتے اور جو ذرا سی کسر رہ گئی ہے اسکو بھی کیوں نہیں پورا کر دیتے لیکن بغیر گوشت ڈالے بھی وہ نمکین چائے کم از کم ہماری اور

ہماری طرح کے دوسرے چائے فروشوں کی نظروں میں تو قورمہ ہی ہے اور تمام دُنیا کے متعلق ہم کچھ نہیں عرض کر سکتے۔ اسی ایک قسم پر کیا منحصر ہے، چائے کی تو ایسی ایسی قسمیں ہیں اور اس قدر کثیر تعداد میں ہیں کہ خود مسٹر طامس لپٹن مالک لپٹن کمپنی لمیٹڈ کے فرشتوں کو بھی اُن کا علم نہ ہوگا۔ ان بیشمار اقسام میں سے بہت سی ایسی ہوتی ہیں جن کو کہا تو جاتا ہے چائے لیکن خدا جانے وہ منضج ہوتی ہیں یا کیا بلا، بہرحال ہم اُن کو چائے تو کہہ نہیں سکتے، اگر ان بیشمار اقسام کے متعلق تفصیل کے ساتھ لکھا جائے تو شاید ہماری عمر کا بیشتر حصہ اسی میں صرف ہو جائیگا خیر اس میں تو کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن ہم کو اندیشہ ہے کہ اسکے باوجود ہم اپنے کام کو تکمیل تک نہ پہونچا سکیں گے۔ بہرحال بعض موٹی موٹی قسمیں تو ایسی ہیں جنکے متعلق کچھ عرض کرنے کو دل چاہتا ہے ملاحظہ فرمائیے۔

ہماری آپ کی طرح چائے کے بھی مذہب ہوتے ہیں۔ یعنی ہندو چائے، مسلمان چائے، وغیرہ۔ ریل کے بڑے بڑے اسٹیشنوں پر تو خیر چائے کی علیحدہ علیحدہ دکانیں ہوتی ہیں جن پر لکھا ہوتا ہے "مسلمان چاء"۔ یا "ہندو چاء" وغیرہ لیکن جن اسٹیشنوں پر دکانیں نہیں ہیں

وہاں بھی گاڑی کے ٹھہرتے ہی یہ آوازیں کان میں آنا شروع ہو جاتی ہیں "ہندو چا، گرم" "مسلمان چا گرم" وغیرہ۔ اور ان دونوں قسم کی چائے کو دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ واقعی یہ چائے ہندو چائے ہے اور یہ چائے مسلمان چائے۔ آپ ہندو چائے لیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ دھوتی باندھتی ہے یعنی آبخورے میں ہوتی ہے۔۔۔ اسی طرح مسلمان چائے ملاحظہ فرمائیں تو وہ پاجامہ اور شیروانی وغیرہ میں نظر آئیگی یعنی پرچ، پرچ کے اوپر پیالی اور پیالی میں پڑا ہوا چمچہ۔ ان دو قسم کی چائے کے علاوہ اگر آپ عیسائی مذہب کی چائے ملاحظہ فرمائیں گے تو وہ سوٹ میں ہوگی یعنی کوٹ، پتلون، واسکٹ، ہیٹ وغیرہ میں کہ پرچ پیالی علیحدہ، دودھ دان الگ، شکردان الگ، کیتلی الگ، توسٹ الگ، مکھن الگ، چمچہ الگ، چھری الگ۔ بہرحال ہر مذہب کی چائے علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے اور ہر چائے کی وضع قطع بھی جداگانہ، یہ تو گویا چائے کی دو مستقل قسمیں ہیں جن میں مذہبی اختلاف ہے لیکن ایسی قسمیں بھی ہیں جن میں صرف معاشرتی اختلاف ہے لیکن وہ مذہبی اختلاف سے زیادہ شدید۔ لکھنؤ کی معطر فضاؤں میں جاڑوں کے شروع ہوتے ہی

ایک طرف تو گلی کوچوں تک میں چائے کی دکانیں کھل جاتی ہیں اور دوسری طرف، ع

نکل آئے گویا کہ مٹی کے پر!!

کی تعداد میں سیکڑوں چاء والے ہر طرف گشت کرتے ہیں اُنکے پاس ایک بالٹی میں کچھ چائے کی پیالیاں پانی میں پڑی ہوئی اور اُس پر ایک تھالی رکھی ہوتی ہے جس پر تھوڑی سی بالائی اور کچھ سموسے ہوتے ہیں دوسرے ہاتھ میں چاء کو ہر وقت گرم رکھنے والا سماور ہوتا ہے اور وہ لکھنؤ کے چاء فروش اپنے شہر کی شعریت سے متاثر ہو کر عجیب غریب طرح چاء بیچتے ہیں۔ مثلاً ایک چاء والے صاحب کا شعر ملاحظہ ہو سے

سموسہ مرا خستہ بالائی نرم ہے
تم پی لو میرے دوستو کیا چاء بھی گرم ہے

اس شعر کے نقائص نہ ڈھونڈھیے صرف یہ دیکھیے کہ ایک چاء والے کا شعر ہے اور دونوں مصرعے نہ صرف موزوں ہیں بلکہ ایک ہی بحر میں ہیں نرم کا قافیہ گرم بھی ہے اور یہ شعر نہ صرف شعر ہے بلکہ مطلع ہے۔ ان چاء والوں کی اور چاء کی دکانوں کی چاء میں بہت کم فرق ہوتا ہے اور دونوں کا تقریباً

یہ حال ہوتا ہے کہ گرم اس قدر گویا سیال جہنم پی رہے ہیں شیریں اس قدر کہ فرہاد بھی نہ برداشت کر سکے یعنی حلق سے معدہ تک ایک سلاخ ڈالتی ہوئی چلی جائے اور ایک مرتبہ اس چاء کا پینے والا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذیابیطس میں مبتلا ہو جائے، رنگ شروع میں سرخی مائل ہوتا ہے لیکن جب پکتے پکتے چاء گاڑھی ہو جاتی ہے تو نیلا ہو جاتا ہے اور بعض اوقات سیاہ بھی ہوتا ہے گہرا نہ سہی ہلکا سہی۔ ہمارا تو خیال ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ چاء مثانہ کمزور کرتی ہے اور چاء خشکی پیدا کرتی ہے اور چائے سے اختلاج ہوتا ہے وغیرہ۔ اگر انھوں نے اس چاء کے متعلق فرمایا ہے تو اب ہم کہتے ہیں کہ بالکل سچ فرمایا ہے۔ بلکہ ہمارا تو خیال ہے کہ یہ چاء خواہ کوئی مرض پیدا کرے یا نہ کرے لیکن اچھے خاصے تندرست کو موت کے گھاٹ اتار سکتی ہے۔ اس چاء کو تو چھوڑنا نہیں بلکہ حرام قرار دیدینا چاہیے، اور حکومت کو چاہیے کہ حفظانِ صحت کے خیال سے اس پر پابندی عاید کردی جائے کہ کوئی شخص بغیر لیسنس حاصل کیے اسکو بیچ نہ سکے۔ اس لیے کہ اس چاء میں اور زہر میں بہت معمولی سا فرق ہوتا ہے۔ ایک چاء وہ ہوتی ہے کہ جسکو "طلسم ہوشربا"، بوستان خیال اور

داستان امیر حمزہ یا الف لیلہ وغیرہ پڑھنے والے اس طرح پیتے ہیں کہ کہ بیچ میں چاء کا پتیلہ چڑھا ہوا ہے اور چاروں طرف حلقہ کیے وہ مردان چینیا بیگم بیٹھے ہوتے ہیں چائے کا دور چلتا جاتا ہے اور ادھر گھلتی بھی جاتی ہے، مکھیوں کی جہل پہل میں یہ دُنیا سے بے نیاز خدا کے بندے کچھ اس محویت سے چاء پیتے ہیں کہ گویا چائے اُن پر طاری ہو جاتی ہے اور وہ چاء میں ڈوب جاتے ہیں انکی کنڈے ٹوٹی ہوئی بال دار چاء کی پیالیوں میں اگر نقش و نگار ہوے تو خیر ورنہ مکھیاں خود نہایت باریک نقش و نگار بنا دیتی ہیں اور اگر پیالیاں نہ بھی ہوں تو وہ تانبے چینی کے داغدار ڈونگوں سے ورنہ مٹی کے کلھڑوں سے کام نکال لیتے ہیں، مطلب تو چاء سے ہے اور سچ تو یہی ہے کہ ؎

یہ اہتمام نہیں کفر چائے نوشی ہے
جو چاء ہو تو ضرورت نہیں ہے پیالی کی

چاء کی ایک اہم قسم مشاعروں اور مجلسوں کی چاء بھی ہے تقریباً ایک ہی قسم کی ہوتی ہے اس چاء کو اگر چاء کہہ کر نہ پلایا جائے تو ممکن ہے کوئی لطف آجائے لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ چاء پلائی جا رہی ہے تو

بس غصہ ہی آجاتا ہے کہ لونگ اور جوتری وغیرہ کی خوشبو خود اعلان کرتی ہے کہ اگر یہی مسالہ جو چائے میں ڈالا گیا ہے تھوڑا سا بھونا جوش دینے کے بعد اس میں ملا دیا جاتا تو شاید وہی مزہ ہوتا جو اس چاء کا ہوتا ہے اگر یقین نہ آتا ہو تو تھوڑی سی آٹے کی بھوسی کر پانی میں جوش دے کر اس میں اُسی نسخہ کے اجزا ڈال دیے جائیں جو مشاعرے اور مجلسوں کی چاء میں ڈالے جاتے ہیں اور پھر اس کو پی کر دیکھا جائے اگر ذرا بھی فرق ہو تو جب ہی کہیے گا، اسی طرح میونسپل الکشن کے زمانہ میں امیدواروں کی طرف سے ووٹروں کو جو چائے ملتی ہے وہ بھی یقیناً شیرمال کے ساتھ لذیذ چیز ہوتی ہے لیکن چاء نہیں ہوتی اور اگر وہ چاء ہوتی ہے تو جو چیز ہم پیتے ہیں وہ چائے نہیں ہے۔ بہرحال دونوں میں سے ایک ہے اور دوسری نہیں۔

خیر ہم کو ان دُنیا بھر کی مختلف چاء کی قسموں سے کیا غرض ہم تو اُسی کو چاء سمجھتے ہیں۔ "جس کا فربہ دم نکلے" اور وہی ہماری زندگی کا سہارا ہے۔ خدانخواستہ شیطان کے کان بہرے اگر ہمکو چائے نہ ملے تو شاید دُنیا والوں کو پھر ہم بھی نہیں مل سکتے۔ اگر کبھی

اتفاق سے چائے کے مقررہ اوقات یعنی صبح سات بجے اور شام کو
پانچ بجے میں ذراسی بھی تبدیلی ہوجاتی ہے تو بس جان ہی پر بن جاتی ہے
وہ عالم ہوتا ہے کہ خدا وہ وقت دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ مثلاً رمضان شریف
میں روزہ رکھ بیٹھے اب صبح سات ہی بجے سے یہ عالم ہوگا کہ گویا رگ رگ
کی روح کھینچ لی گئی ہے، جماہیوں پر جماہیاں آئینگی۔ ہاتھ پیروں میں کمزوری
محسوس ہوگی طبیعت نڈھال ہوجائیگی تھوڑی دیر کے بعد سر گھومنا شروع
ہوگا، پھر دردسر شروع ہوگا یہاں تک کہ شام کے وقت ہم بالکل عالم
نزع میں نظر آئیں گے۔ لیکن عین دم نکلنے سے قبل یعنی مغرب کے وقت
جیسے ہی اذاں ہوگی ہم خود بخود یہ کہتے ہوئے اُٹھ بیٹھیں گے کہ ؎

مؤذن مرحبا بروقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

اور فوراً ٹی کوزی ہٹا کر کیتلی سے اُس دو آتشہ ارغوانی رنگ والی چاء
کو پیالی میں ڈھالیں گے، اس میں شکر ڈالیں گے اور دودھ ملا کر اُس
ارغوانی رنگ کو سنہرا رنگ بنادیں گے اس کے بعد اس کا پہلا ہی
جرعہ حلق سے اُترتے ہی تمام دن کی کلفت کو خواب و خیال کردیگا۔
کہ جیسے آب حیات اُٹھا کر پی لیا رگ رگ میں زندگی کی لہر دوڑ جائیگی

اور ایسا معلوم ہوگا کہ گویا خدا نے حیات تازہ بخشی ہے۔ یہ تو خیر اس وقت کی بات ہے جب تمام دن بغیر چاء کے تشنہ لبی میں گزرا ہو، لیکن روزانہ یہی ہوتا ہے کہ صبح اُٹھتے ہی اس کافرہ کی یاد ستاتی ہے اور جب تک وہ کیتلی کی پری نظروں کے سامنے نہیں آجاتی بلکہ جب تک ہم اس کیتلی کی پری کو حلق کے نیچے نہیں اُتار لیتے، صبر نہیں ہوتا، اسکو چاہے ہمارا عشق سمجھیے یا چاء کا حُسن۔ بہرحال ہم اس بات کے سختی سے قائل ہیں کہ اگر جنت میں چاء نہیں ہے تو پھر واقعی۔ ع

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت کیا ہے

لیکن جہاں تک ہمارا خیال ہے فطرت نے ایسی فاش غلطی یقیناً نہ کی ہوگی کہ جنت میں چاء نہ رکھی ہو بلکہ جہاں دودھ اور شہد کی نہریں ہونگی اُنہی کے قریب چاء کا آبشار بھی ہوگا ورنہ اس جنت سے جس میں چاء نہ ہو وہ اسٹیشن ہزار درجہ اچھے ہیں جن پر ہندو چاء اور مسلمان چاء ہوتی ہے۔ خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں معلوم نہیں کیا ہو ؎

اب تو ہم چاء خوب پیتے ہیں
عاقبت کی خبر خدا جانے

لیکن اس کو ہماری وصیت سمجھ کر ہمارے تمام اعزہ تمام دوست،
تمام دشمن اس مضمون کو پڑھنے والے بلکہ تمام برادران ملک وملت
جناب صدر معزز خواتین اور حاضرین جلسہ سب نوٹ کرلیں کہ ہمارے
مرنے کے بعد بلکہ ابھی سے اگر وہ لوگ وقتاً فوقتاً ایک پیالی چائے پر
ہمارا فاتحہ پڑھ دیا کریں گے تو خدا اُن کو نیک اجر دیگا- ورنہ یہ تو
ظاہر ہی ہے کہ قیامت کے دن سب کا دامنگیر ہونا ہمارے بس
کی بات نہیں- لیکن ہم اپنی وصیت کا جو دوسرا حصہ پیش کرنے والے
ہیں وہ یقیناً اس قدر اہم ہے کہ اگر اس کو بھی ہمارے پس ماندگان
نے یوں ہی ٹال دیا تو ہم بتائے دیتے ہیں کہ اچھا نہ ہوگا اور اس صورت
میں ہم یقیناً مجبور ہونگے کہ حشر کے دن ہمارا ہاتھ ہوگا اور ہماری وصیت
کے ٹالنے والوں کا گریبان یا دامن جو کچھ بھی مل جائے- وہ وصیت
یہ ہے کہ ہم چاہے جس گوشۂ دنیا میں راہیٔ ملک عدم ہوں لیکن سب سے
پہلے تو یہ کوشش کی جائے کہ ہمارے جسد اطہر کو آسام لے جایا جائے
اور وہاں دریائے ارادوی کے کنارے والے چائے کے باغوں میں
کوئی بہتر جگہ تلاش کر کے ہم کو سپرد خاک کیا جائے- اور اگر یہ نہ ہوسکے

ماسٹر صاحب

"آخر یہ کب تک یوں ہی گلی ڈنڈا اُڑاتا پھریگا؟ تم کو تو جیسے کوئی فکر ہی نہیں ہے کہ تعلیم کا زمانہ نکلا جا رہا ہے اگر کچھ دن اور کھیل کود میں پڑا رہا تو بس پھر پڑھ چکا۔"

والدہ صاحبہ نے اس خاکسار کے متعلق یہ الفاظ والد صاحب سے اُس وقت کہے جب وہ بیچارے دن بھر کے تھکے ماندے رات کو حقہ پیتے پیتے سو جانے کے قریب تھے چنانچہ اُنھوں نے گویا چونک کر جواب دیا۔

"ایں کیا کہا؟ تعلیم کا زمانہ نکلا جا رہا ہے؟ حالانکہ اب تعلیم کا زمانہ آیا ہے۔ بہرحال میں خود اس فکر میں ہوں کہ کوئی معقول سا ماسٹر مل جائے تو اس کو پڑھنے بٹھا دوں۔"

اسکے بعد ماسٹر کی نوعیت اور ماسٹروں کی جملہ اقسام کے متعلق

دونوں میں بحث ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ والد صاحب تو صرف جمائیاں لیتے رہے مگر ہم سنتے سنتے سو گئے اور پھر ہم کو نہیں معلوم کہ کیا ہوا۔

اس واقعہ کے تین یا چار دن کے بعد ایک چرکٹ قسم کا ادھیڑ عمر انسان بہ حیثیت ماسٹر کے والد صاحب خدا جانے کہاں سے پکڑ لائے اور ہم کو ان حضرت کے سپرد کر دیا۔

یہ ماسٹر وضع قطع کے اعتبار سے ہمارے سائیس گنگو کے بھائی بند معلوم ہوتے تھے اور کچھ ایسی رونی صورت پائی تھی کہ اگر یہ بیچارے بجائے ہم کو پڑھانے کے بھیک مانگتے تو زیادہ کامیاب رہتے بہرحال اب تو وہ ماسٹر ہی تھے اور ہم ان کے شاگرد رشید۔ لہٰذا ہم نے ان سے شرف تلمذ حاصل کرنا شروع کر دیا اور مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی اردو ریڈر کے علاوہ کننگ پرائمر کا سبق بھی لینے لگے۔ اگر استاد قابل اور شاگرد ذہین ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ تعلیم کامیاب نہ ہو۔ چنانچہ آپ کو سُن کر یہ حیرت ہوگی کہ چار پانچ مہینہ کے اندر ہم نے اردو ریڈر بھی بفضلہٖ ختم کر دی اور کننگ پرائمر کے بھی پندرہ سولہ صفحے پڑھ گئے۔ اسکے علاوہ اے بی سی، ڈی، مختلف طریقوں پر لکھنا سیکھ گئے۔ اور ہمو ٹنگ کے ہندسے

اُردو اور انگریزی میں لکھنا سیکھ لیے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ چار پانچ
مہینہ میں اس سے زیادہ ایک ماسٹر اور کیا پڑھا سکتا تھا اور ایک
ذہین شاگرد اور کیا پڑھ سکتا تھا؟ مگر باوجود ماسٹر صاحب کی اس
محنت اور ہماری اس ذہانت کے والدہ صاحبہ کو ہمیشہ یہ شکایت
رہتی تھی کہ ماسٹر صاحب کچھ پڑھاتے وڑھاتے نہیں ہیں اور ہمیشہ
جلدی سے چھٹی دے دیا کرتے ہیں۔ حالانکہ اُن کو خوش ہونا چاہیے تھا
کہ جس سبق کو دوسرے ماسٹر گھنٹوں میں پڑھایا کرتے ہیں اور سبق
ہمارے ماسٹر صاحب منٹوں میں پڑھا دیتے تھے اور وہی سبق جس کو
کودن قسم کے لڑکے گھنٹوں رٹتے ہیں ہم چند منٹ میں پڑھ کر پھینک دیتے
تھے۔ پھر اسکے بعد آخر اسکی کیا ضرورت تھی کہ ہم خواہ مخواہ بیٹھے چکی پیسا
کرتے۔ اور ماسٹر صاحب بلاوجہ ہم کو گھنٹوں رٹاتے۔

قصہ اصل میں یہ تھا کہ ماسٹر صاحب تھے تو اچھوت اقوام کے
مگر بڑی شریف طبیعت پائی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ ان کا ایسا ماسٹر بھی
قسمت ہی سے کسی شاگرد کو مل سکتا ہے۔ یہ بیچارے ہم کو دو گھنٹہ روز
پڑھانے پر ملازم تھے مگر ہم کو تو یاد نہیں پڑتا کہ کبھی آدھ گھنٹہ سے زیادہ

پڑھایا ہوا ور نہ بھی اس طرح کہ پہلے تو آتے ہی ہم کو اُردو ریڈر کا سبق
اس طرح پڑھایا کہ خود پڑھتے گئے اور ہم سے کہا کہ آواز سے آواز ملاکر تم
بھی پڑھتے جاؤ۔ چنانچہ ماسٹر صاحب کتاب دیکھ کر پڑھتے تھے اور ہم
ماسٹر صاحب کا مُنہ دیکھکر اُنکے مُنہ سے نکلے ہوئے الفاظ دُہراتے تھے
اسکے بعد کل کا سبق اس طرح سُنتے تھے کہ ہمارے آگے کتاب کھدی
اور کہا سُناؤ سبق، ہم کبھی کتاب دیکھتے اور کبھی ماسٹر صاحب کا مُنہ،
اسکے بعد وہ خود ہی کہتے :۔

"رب کا شکر ادا کر بھائی جس نے ہماری گائے بنائی"

ہم یہ اشارہ ملتے ہی پڑھ دیا کرتے تھے کہ ؎

"رب کا شکر ادا کر بھائی جس نے ہماری گائے بنائی"

ماسٹر صاحب خوش ہو کر کہتے تھے "شاباش! ہاں اور آگے ؎

اُس مالک کو کیوں نہ پکاریں جس نے پلائیں دودھ کی دھاریں"

ہم پھر ماسٹر صاحب کی آواز سے آواز ملاکر یہ شعر بھی پڑھ دیتے تھے۔
لیجیے قصہ ختم گویا سبق یاد ہے اسکے بعد اسی طرح کنگ پرائمر کا سبق
پڑھایا اور سُنا جاتا تھا۔ پھر ماسٹر صاحب سلیٹ ہمارے سامنے رکھکر

ہمارا ہاتھ جس میں سلیٹ کی پنسل ہوتی تھی قلم کی طرح اپنے ہاتھ میں لیکر گنتی لکھانا شروع کرتے تھے اور کوئی پانچ ہی منٹ میں یہ کام بھی ختم ہو جاتا تھا مختصر یہ کہ آدھ گھنٹے کے اندر اردو انگریزی اور حساب کی تکمیل تعلیم ہو جاتی تھی اسکے بعد نہ ہمارا پڑھنے میں دل لگتا تھا نہ ماسٹر صاحب بلا وجہ چکی پیسوانے کی تائید میں تھے چنانچہ دو گھنٹہ کا کام آدھ گھنٹہ میں پورا کرنے کے بعد ہم کو اور ماسٹر صاحب کو دونوں کو چھٹی مل جایا کرتی تھی اور یہی بات والدہ صاحبہ کو ناگوار ہوتی تھی وہ غالباً یہ چاہتی تھیں کہ ماسٹر صاحب مسلسل دو گھنٹہ تک خواہ مخواہ پڑھاتے رہیں اور ہم بلا وجہ دو گھنٹہ تک پڑھ کر اچھے خاصے دماغ کو خراب کر لیں۔ چنانچہ روز جب ہم پڑھ کر گھر میں جاتے تھے ہم سے یہی سوال ہوتا تھا کہ "بس پڑھ چکے۔ کیا ماسٹر صاحب گئے؟" اور جب ہم یہ کہتے کہ ہاں پڑھ چکے اور ماسٹر صاحب بھی گئے تو والدہ صاحبہ ہمیشہ یہی کہا کرتی تھیں کہ "خدا جانے یہ ماسٹر اتنی دیر میں سبق گھول کر پلا دیتا ہے یا کیا کرتا ہو کہ آتے دیر نہیں ہوئی اور پڑھا لکھا کر چھٹی بھی دے دی"۔

بہر حال ہماری تعلیم جاری تھی اور ہم فاضل ہو جانے کے قریب ہی تھے

کہ ایک دن والد صاحب کو بھی ذرا ہماری تعلیم کا خیال آیا اور اُنھوں نے ہم کو پاس بُلا کر پوچھا:۔

"تم نے انگریزی کہاں تک پڑھ لی"

ہم نے کہا۔ "آدھی کتاب پڑھ چکے ہیں"

والد صاحب نے اپنا انگریزی اخبار اُٹھا کر ایک موٹے سے حرف پر اُنگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ کون سا حرف ہے؟"

ہم نے اُس حرف کو گھور کر دیکھا اور غور کرنا شروع کیا کہ یہ کون سا حرف ہو سکتا ہے مگر کافی غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ یہ خواہ کوئی بھی حرف ہو بہرحال ہماری کتاب میں نہیں ہے اور نہ ہم نے اب تک اسکو کہیں دیکھا ہے۔ والد صاحب نے پھر کہا "بتاؤ یہ کون سا حرف ہے؟"

ہم نے جواب دیا "یہ حرف تو ہم نے نہیں پڑھا"

والد صاحب نے کہا۔ "ایں کیا کہا۔ یہ حرف تم نے نہیں پڑھا اور آدھی کتاب پڑھ گئے۔ اچھا یہ کون سا حرف ہے۔ ایک اور ایسے حرف پر والد صاحب کی اُنگلی رکھی ہوئی تھی۔ یہ حرف بھی کچھ عجیب قسم کا تھا گویا چار کی پیالی کا ٹوٹا ہوا کُنڈا ہم نے اسے غور سے دیکھ کر

گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہمیں نہیں معلوم" والد صاحب نے طنز کے ساتھ
کہا "ماشاء اللہ خوب آپ نے آدمی کتاب پڑھی ہے۔ اچھا یہ کیا ہے؟"
ایک تیسرے حرف پر والد صاحب نے اُنگلی رکھدی۔ یہ حرف بالکل
ڈلی کاٹنے کے سروتے کی طرح کا تھا اور غالباً حرف نہیں تھا بلکہ سروتا
ہی تھا لہٰذا ہم نے کہا "سروتا ہے" والد صاحب نے حیرت سے کہا۔
کیا کہا، سروتا ہے، سروتا کیا؟" ہم نے والد صاحب کی محدود معلومات
پر ہنستے ہوئے کہا "آپ کو نہیں معلوم سروتا کس کو کہتے ہیں، جس سے
ڈلی کاٹی جاتی ہے" والد صاحب نے ہم کو اور اس حرف کو یکے بعد
دیگرے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ڈلی کاٹنے کا سروتا ہے، کیا
تمھارے ماسٹر نے یہی تم کو بتایا ہے؟" ہم نے کہا۔ نہیں ماسٹر صاحب نے
تو نہیں بتایا میں خود کہہ رہا ہوں۔" والد صاحب نے کہا "اچھا اپنی
سب کتابیں لاؤ"

ہمارے اس امتحان سے والدہ صاحبہ کو بھی گویا دلچسپی پیدا ہو گئی تھی
چنانچہ وہ بھی گھر کا دھندا چھوڑ کر وہیں بیٹھی ہوئی تفریح فرما رہی تھیں اور
اور بیچ بیچ میں والد صاحب کو بھرتی جاتی تھیں کہ "کسی دن ان ماسٹر صاحب نے

آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں پڑھایا۔ اور میں تو سمجھتی ہوں کہ یہ ماسٹر پڑھاتے وڑھاتے نہیں یوں ہی وقت خراب کرتے ہیں وغیرہ۔

بہر حال ہم اپنی کتابیں لے آئے اور والد صاحب نے کنگ پر انگر لے کر پوچھنا شروع کیا۔

"ریٹ معنی ؟"

ہم نے جلدی سے کہا "ایم۔اے۔این۔ ریٹ معنی آدمی۔"

والد صاحب نے ذرا تیز آواز میں پوچھا "ایم۔اے، این، ریٹ ہوا؟"

ہم نے گھبرا کر "جی جی نہیں۔ ایم۔اے، این بشاید کیٹ ہوا کیٹ معنی بلی"

والد صاحب نے کنگ پر انگر رکھ کر کہا ماشاءاللہ خوب ان ماسٹر صاحب نے پڑھایا ہے اور خوب آپ نے پڑھا ہے۔ اچھا ذرا اُردو کی وہ کتاب تو لائیے جو آپ ختم کر چکے ہیں۔"

ہم نے کتاب دیدی اور والد صاحب نے کتاب کھول کر ہمارے سامنے رکھدی کہ پڑھو۔ مگر آپ ہی بتائیے کہ یہ بھی پڑھنے کا کوئی طریقہ تھا کہ ہم خود بخود پڑھنے لگیں۔ ہم نے تو اب تک اس قسم کا پڑھنا پڑھا تھا کہ کوئی پڑھے تو ہم آواز سے آواز ملا کر اسکے ساتھ پڑھیں لہٰذا اس موقع پر

ہم چپ ہو رہے اور انتظار کرنے لگے کہ اب والد صاحب پڑھینگے اور ہم کو آواز سے آواز ملا کر پڑھنا پڑیگا مگر بجائے اسکے کہ وہ پڑھتے اُنھوں نے پھر کہا "پڑھو بھائی پڑھتے کیوں نہیں، یہ کتاب تو تم ختم کر چکے ہو"۔

ہم نے کہا "جی ہاں، یہ تو بہت دن ہوئے ختم ہو گئی۔ آپ پڑھیے تو میں بھی پڑھوں"۔

والد صاحب نے کہا "میں پڑھوں یعنی میں؟ کیا مطلب اس سے"۔

ہم نے کہا "جی ہاں آپ پڑھیے گا جب ہی تو ہم پڑھینگے"۔

والد صاحب نے انتہائی حیرت سے کہا "میں پڑھوں گا جب تم پڑھوگے۔ یہ کیا؟"

ہم نے سادگی سے کہا۔ "جس طرح آپ پڑھیں گے اُسی طرح تو ہم آواز ملائیں گے"۔

والد صاحب نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔ "تو کیا تم کو اسی طرح پڑھایا گیا ہے؟"

ہم نے کہا "جی ہاں ہمکو ماسٹر صاحب نے اسی طرح ——"

اتنے میں ماسٹر صاحب نے باہر سے آواز دی اور والد صاحب نے ہم سے کہا کہ "جاؤ، ماسٹر صاحب آ گئے ہیں پڑھو جا کر۔"

ماسٹر صاحب کے آ جانے سے ہماری جان میں جان آئی اور والد صاحب سے نجات ملی۔ ہم ماسٹر صاحب کے پاس چلے گئے اور والد صاحب کوٹھے پر چلے گئے۔ ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

ہم نے باہر جاتے ہی ماسٹر صاحب سے آج کے امتحان کا ذکر کیا کہ کس طرح والد صاحب نے ہم سے انگریزی اخبار پڑھوانا چاہا اور کس طرح اردو پڑھوا رہے تھے اور اس کے بعد کل کا سبق سنانے بیٹھ گئے۔ ماسٹر صاحب نے کہا۔ "ہاں کل کا سبق سناؤ۔ ع رات گزری نور کا تڑکا ہوا،"

ہم نے کہا ع "رات گزری نور کا تڑکا ہوا"

ماسٹر صاحب نے پڑھا ع ہوشیار اسکول کا لڑکا ہوا۔

ہم نے آواز ملا کر پڑھا ع ہوشیار اسکول کا لڑکا ہوا

چونکہ کل کا سبق ہم کو یاد تھا لہٰذا ہم کو نیا سبق دیا گیا اور پھر انگریزی کا سبق شروع ہوا۔ انگریزی کے بعد حساب اسی طرح سکھایا گیا

کہ ہمارے ہاتھ میں نسبل تھی اور ہمارا ہاتھ معہ پنسل کے ماسٹر صاحب کے ہاتھ میں تھا اور سلیٹ پر سو تک کی گنتی لکھی جا رہی تھی۔ گنتی ختم ہونے کے بعد ہی ہم نے ماسٹر صاحب سے کہا "اچھا اب جائیے"۔

ماسٹر صاحب نے کہا "ابھی تیس ہی منٹ ہوئے ہیں اور پڑھو"۔

ہم کتابیں چھوڑ کر ماسٹر صاحب کی گردن میں لٹک گئے۔ "آپ بڑے اچھے ہیں اب چھٹی دیدیجیے۔ پھر ہم آپ کو پیسہ دینگے"۔

ماسٹر صاحب نے کہا۔ "آج کتنے پیسے ہیں"۔

ہم نے جیب سے پیسے نکالتے ہوئے کہا۔ "آج صرف تین ہیں ایک قرض رہا اگر اب چھٹی دیدیجیے۔ یہ کہہ کر ہم پھر ماسٹر صاحب کی گردن میں لٹک گئے اور اُنکی مونچھیں مروڑنے لگے۔

ماسٹر صاحب نے پیسے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "اچھا جاؤ"۔ اور خود بھی جانے کے لیے اُٹھے ہی تھے کہ آواز آئی

"ماسٹر صاحب ذرا ٹھہریے گا"۔

والد صاحب اوپر کی کھڑکی سے جھانک رہے تھے ماسٹر صاحب ان کو دیکھکر ٹھہر گئے اور والد صاحب کوٹھے کے اوپر سے اُتر کر ماسٹر صاحب کو

پانچ روپیہ کا ایک نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ "اب آپ کل سے زحمت نہ کیجیے گا۔"
ہم کو ان ماسٹر صاحب کی جدائی کا تو چنداں افسوس نہیں ہوا۔ مگر تین ہی چار دن کے بعد ایک دیوزاد ماسٹر صاحب ہم کو پڑھانے کے لیے مقرر کر دیے گئے جن سے والد صاحب اور والدہ صاحبہ دونوں محض اس لیے خوش تھیں کہ وہ نوکر تو تھے دو گھنٹہ کے لیے مگر ہم کو گھونٹا کرتے تھے تین سوا تین گھنٹہ تک اور وہ بھی خالی ہاتھ نہیں بلکہ قمچی کی مدد سے، بہر حال ان کی ان جفاکاریوں کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ ہم چائے کی پیالی کے کنڈے کو "پی" اور سروتے کو "آر" کہنے لگے۔

جس کے لئے کیا سفر
II

جس کے لئے کیا سفر!

خدا نہ کرے کہ کبھی کسی شریف مرد آدمی کو ریل میں یا اسٹیشن پر یا مسافر خانہ میں یا ٹکٹ گھر کے قریب کسی سے عشق پیدا ہو جائے۔ اس قسم کا عشق جسکا تعلق ریلوے سے ہو بیچارے عاشق کو بجائے "صحرا بصحرا" پھرانے کے "اسٹیشن بہ اسٹیشن" پھراتا ہے اور وہ تھرڈ کلاس کے زنانہ ڈبّے کی کھڑکی سے جھانک کر دل لے جانے والا جلوہ پھر مشکل ہی سے نظر آتا ہے اس لیے کہ وہ ریل ہوتی ہے جس کا کام ہے چلنا، کوئی جلوہ گہِ ناز تو ہے نہیں کہ ایک ہی جگہ پر قائم رہے اور عشاق پس دیوار بیٹھے سر پھوڑا کریں۔ اس ریل کے عشق کا تو بس یہی علاج ہے کہ یا تو اُس رہزنِ تمکین و ہوش کا ٹکٹ دیکھکر اسی جگہ کا ٹکٹ خرید لیا جائے اور یا "نیست امام کی وہی ہماری ابکا

ساتھ ہو لے، یا پھر اُسی ٹرین کے نیچے لیٹ کر جان آفریں کو جان سپرد کر دی جائے۔ لیکن ایمان کی بات تو یہ ہے کہ عشق کا حملہ ہوتے ہی بیچارے عاشق کے ہوش و حواس ہی کب قائم رہتے ہیں کہ اس پروگرام کو پیش نظر رکھ کر اس پر عمل کرے۔ نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ حُسن تو بجلی گرا کر ریل کے ساتھ چھک چھک کرتا ہوا چل دیتا ہے اور بیچارہ عاشق پلیٹ فارم پر اس طرح تڑپتا ہے گویا ریل سے کچل کر جان دے رہا ہو۔ اگر عشق نے زیادہ ستایا تو اُسی سمت کو جانے والی کسی گاڑی پر خواہ وہ مال گاڑی کیوں نہ ہو بیٹھکر عاشق اپنی خانماں بربادی بلکہ آوارہ گردی کی بسم اللہ کرتا ہے اور پھر اسکے بعد اسکی زندگی جی، آئی، پی۔ این، ڈبلیو، آر، اور اسی طرح کی نہیں معلوم کتنی ریلوں میں سفر کرتے گزر جاتی ہے لیکن "پھر دیکھ لوں اک بار میں جلوہ ترا" کی تمنا کبھی پوری نہیں ہوتی۔

یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اختر نے جھانسی کے اسٹیشن پر دہلی سے بمبئی جانے والی اکسپرس کی ایک "پنجرہ" کو دل دے ہی دیا۔ اختر تھے تو ہمیشہ کے "ہونّو"، مگر ہم کو یہ اُمید نہ تھی کہ ان میں بھی عشق و محبت کی صلاحیت موجود ہے۔ جب وہ حضرت اکسپرس کے آنے کے

زنانہ درجہ کے سامنے بڑی دیر تک منہ اُٹھائے کھڑے رہے تو ہم اُنکی اس حرکت کو بھی "ہو نو پن" سمجھتے رہے۔ لیکن جب اکسپرس کے جانے کے بعد بھی وہ مجسمہ بنے کھڑے رہے تو ہم کو ذرا تشویش ہوئی کہ کہیں ان پر فالج تو نہیں گرا ہے، کہیں ان کے قلب کی حرکت تو نہیں بند ہو گئی ہے، کہیں ان پر جادو کر کے کسی نے پتھر کا تو نہیں بنا دیا، کہیں یہ سردی کی شدت سے اکڑ تو نہیں گئے۔ یہاں تک کہ یہ شبہات رفتہ رفتہ بڑھنے لگے، اور ہم پر ایک خوف کی سی کیفیت طاری ہو گئی کہ ان کو چھونے کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی، دور ہی سے کھڑے ہوئے آوازیں دے رہے تھے، اگر اسٹیشن ماسٹر کو اطلاع دیتے تو اندیشہ تھا کہ کہیں لاوارث مال سمجھ کر ان کو مال گودام میں نہ ڈال دیا جائے، اور خود اس لئے نہیں چھوتے تھے کہ کہیں ہم بھی ایسے ہی نہ ہو جائیں، لیکن آخر یہ کب تک ہوتا۔ یہ تو ہونے سے رہا کہ اس بیچارے کو چھوڑ کر چلے جاتے، حالانکہ نئی روشنی کے دوستوں کا یہی فیشن ہے کہ وقت پڑنے پر بیگانہ بن جاتے ہیں، لیکن ہم اس کو ذرا شرافت سے بعید سمجھتے ہیں۔ لہذا دل مضبوط کر کے اُنکی طرف بڑھے اور درود شریف وغیرہ پڑھ کر اُنکے شانہ پر ہاتھ

رکھ دیا۔ وہ چونک پڑے اور اُنکے چونکنے سے ہم اُچھل پڑے۔ اُنھوں نے ایک ''زہریری سانس'' کھینچکر کہا: ''کیا اکسپرس چھوٹ گئی؟''
انکے اس سوال سے ہم کو اندیشہ ہوا کہ بیچارے کا دماغ خراب ہوگیا لہٰذا ہم نے ذرا پیچھے ہٹ کر کہ کہیں حملہ نہ کر بیٹھیں کہا: ''کیا تم سو رہے تھے؟''
اختر۔ ''کیا تم سو رہے تھے؟''
میں۔ ''یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کیا تم سو رہے تھے، جو اکسپرس کے چھوٹنے کی خبر بھی نہ ہوئی''
اختر۔ واقعی میں سو رہا تھا۔ میں نے خواب دیکھا ہے وہ خواب میں بھی۔ وہ خواب تھی''
میں۔ ''عجیب چیز ہیں آپ بھی یعنی گھنٹہ بھر سے مُنہ اُٹھائے کھڑے ہیں، گویا بنا کر کھڑے کر دیے گئے ہیں''
اختر۔ ''ہاں بنا کر کھڑا کر دیا گیا ہوں دیوانہ بنا کر، سودائی بنا کر، وحشی بنا کر، مجنوں بنا کر''
میں۔ ''پاگل تو ہو ہی اس میں بُرا ماننے کی کون سی بات ہے، آخر تم ہی بتاؤ یہ کون سی ادا تھی؟''

اختر۔ "ادا، ہاں ادا تھی جو میری قضا بنے گی اور جس کو میں بقا سمجھونگا۔"

اب تک تو ہم مردبنے اُنکی اوٹ پٹانگ باتیں سُنا کیے لیکن اب ایسی دہشت طاری ہوچکی تھی کہ اگر وہ ہماری طرف بڑھتے تو ہم چیخ مارکر یا تو بھاگ جاتے یا بیہوش ہوکر زمین پر گر پڑتے۔ لیکن ہم نے اپنے کو اور بھی مضبوط کیا اور تھوڑا پیچھے ہٹ کر ذرا تھراتی ہوئی آواز سے دریافت کیا۔

"یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو۔"

اختر۔ "اچھا وہ کون تھی؟"

میں۔ "کون؟"

اختر۔ "اچھا وہ کون تھی؟"

میں۔ "کون"

اختر۔ "وہ جو گئی ہے۔"

میں "بمبئی دہلی اکسپرس تھی۔"

اختر۔ "نہیں وہ غارت گر ایمان جو اس میں بیٹھی تھی جو مجھ کو اپنا بنا کر یہیں چھوڑ گئی جو چلتے وقت مجھ سے ملی بھی نہیں۔ جس نے ادھر

رخ بھی نہ کیا۔ جو مجھکو اپنا بنا کر جانتی بھی نہیں ع

"ہائے جسے خبر نہیں کچھ مرے حال زار کی"

میں۔ "کیا ہوا کیا؟ کس کو تم کہہ رہے ہو۔ میں ابھی نہیں سمجھا"۔

اختر۔ "وہی میرے دل کی مالکہ"۔

میں۔ "کیا کوئی عورت تھی"۔

اختر۔ "ہاں ایک کافرہ تھی، ایک حور تھی، ایک مست شباب تھی، جسکی ایک بہکی ہوئی نظر میرا دل چھین لے گئی، اور جس نے مجھکو تڑپا کر ایک نظر بھی نہ ڈالی"۔

میں۔ استغفر اللہ اتنی دیر کے بعد اب ہم سمجھے کہ آپ پر عشق کا بھوت سوار ہے اور اس خطرناک عشق کا جسکو ہم مہلک ترین عشق یعنی "ریلوے عشق" سمجھتے ہیں۔

خیر، ہمارا خوف تو دور ہوا مگر بیچارے اختر کی حالت پر ہم نے افسوس ہی نہیں کیا بلکہ انا للہ و انا الیہ راجعون بھی پڑھ دیا۔ اس لیے کہ اب ہماری نظروں کے سامنے انکا مستقبل موجود تھا، اور ہم جانتے تھے کہ اگر واقعی ان حضرت نے دل دے دیا ہے تو اب انکا علاج پاگل خانہ میں بھی

نہیں ہو سکتا۔ ہم اُن کے قریب آئے اُن کے سر سے ٹوپی اُتار کر ہوا دی، لیکن جب وہ ہوا لگنے سے سردی کی شکایت کرنے لگے تو ہم نے اُن کو تسلی دی۔ کامیابی کے سبز باغ دکھائے اور دل بہلانے کی ترکیبیں کرتے رہے، لیکن وہ یہی پوچھا کیے کہ "آخر وہ تھی کون ؟"

(۲)

عشق کوئی ایسی ویسی چیز تو ہے نہیں کہ دو چار ادھر اُدھر کی باتیں کیں اور وہ چلا گیا جو بیچارے ان عاشقوں کو زندگی بھر سمجھاتے ہیں اُنھیں کا دل خوب جانتا ہوگا کہ ان لوگوں سے کتنا سر کھپانا پڑتا ہے اور یہ لوگ سمجھانے سے کتنا سمجھتے ہیں، واللہ عجیب بات ہے کہ یہ عاشق لوگ جو بات کہی جائے اُسکا اُلٹا ہی مطلب ہمیشہ سمجھا کرتے ہیں اور سمجھانے والے سے بڑھ کر دُنیا میں ان لوگوں کا دشمن اور کوئی نہیں ہوتا۔ اسکو "ناصح ناداں" کہتے ہیں۔ اس کو اپنی زبان میں طرح طرح کی مہذب گالیاں دیا کرتے ہیں اور اس سے ایسا جلتے ہیں گویا یہ بھی رقیب ہے۔ تقریباً یہی حال ہمارا تھا کہ ہم اپنے نوگرفتار عشق اختر کو سمجھانا چاہتے تھے، اور وہ بھی صرف اس لیے کہ ہمارا دوست ہے اور مجمع احباب میں اُسکو وہی درجہ

حاصل ہے جو تاش کی گڈی میں جوکر کو، یا تھیٹر میں کومک کو یا اخبارات میں پینچ اخبارات کو حاصل ہوتا ہے۔ اور اگر کہیں وہ عشق کا دیوانہ بنکر جان پر کھیل گیا تو ہمارا لطف زندگی بھی باقی نہ رہیگا لیکن وہ حضرت ہمارے اس جذبہ کی قدر یہ فرما رہے تھے کہ ہم کو خود غرض، ابن الوقت، احمق، طوطا چشم، غیر ہمدرد، نامعقول، بیوقوف، اور اس قسم کی جتنی معزز گالیاں ہو سکتی ہیں، سب دے رہے تھے۔ وہ تو کہیے کہ ہم انکو مرفوع القلم سمجھ چکے تھے، ورنہ یہ عشق وشق تو سب دھرا رہ جاتا، پلیٹ فارم پر اچھی خاصی فوجداری ہو جاتی۔ اور انصاف سے دیکھیے تو فوجداری کی بات بھی تھی کہ آپ کسی شریف آدمی کو بُرا بھلا کہیں اور وہ خاموش رہے یہ کیسے ممکن ہے، ملاحظہ فرمائیے کہ ہم نے تو اُن سے کہا کہ "بھائی جو کچھ ہونا تھا ہوا، اگر وہ موجود ہوتی تو پولیس وغیرہ کے سپرد کر دیتے اور اگر اُسکے پاس سے تمھارا دل برآمد کر لیتی تو تم کو دل مل جاتا۔ اور اُس کو سزا ہو جاتی، لیکن اب تو وہ ہے ہی نہیں، لہٰذا اب جانے دو، چھوڑو اس قصہ کو اور چلو گھر"۔ اب بتائیے کہ ہم نے اُن سے کون سی غیر شریفانہ بات کہی، لیکن وہ بگڑ گئے اور کہنے لگے "آپ کی ہمدردی کا شکریہ، آپ

تشریف لے جائیے میں آجاؤنگا۔ سچ ہے۔ ؎

جس پہ گزری ہو وہی جانے
جو کہ بیدرد ہو وہ کیا جانے

میں:۔ "تو بتاؤ کہ آخر میں کیا کروں؟ جو کہو وہ کروں، اب تو جو کچھ گزرنا تھی گزر چکی، اب صبر کرو، خداوند کریم نعم البدل دیگا"

اختر:۔ "نعم البدل، اور اسکا، ناممکن ہے، اور اگر ممکن بھی ہو تو مجھ کو منظور نہیں"

میں:۔ "اچھا تو پھر اب کیا کیا جائے"

اختر:۔ "کچھ نہیں، بس مجھ کو چھوڑ دو، میں اسی طرف جاؤنگا جدھر میرا دل لے جایا گیا ہے"

میں:۔ "یعنی ریل کی پٹری پٹری چلے جاؤ گے اچھا پھر"

اختر:۔ "مجھ کو پھر کے بعد کچھ نہیں معلوم، بہرحال مجھ کو چھوڑ دو"

میں:۔ "ذرا صبر سے کام لو دیوانگی کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا"

اختر:۔ "بھائی صاحب تو آپ اپنی صحیح الدماغی کو لیے دولت کدہ تشریف لیجائیں، مجھ کو میری قسمت پر چھوڑ دیں"

میں:۔ "اچھا میں نے چھوڑا تم کو، اب بتاؤ تم کیا کرو گے؟"

اختر:۔ "میں اسی طرف کو جاتا ہوں جدھر اکسپرس گئی ہے اور اسکے

لیے جاتا ہوں جسکا پتہ و نشان بھی مجھ کو نہیں معلوم "

میں :- اچھا تم مجھ کو آدھ گھنٹہ دو کہ میں اپنے حواس بجا کرکے شاید کوئی ترکیب نکال سکوں "

اختر میرزا بات پر راضی ہو گئے اور میں نے یہ طے کرنے کے بعد کہ اُنکی ضد پوری کرنی جائے۔ یہ فیصلہ کیا کہ دوسری بمبئی کی طرف جانے والی گاڑی پر تھوڑی دُور تک اُنکو سیر کرا دی جائے۔ لہذا میں نے ٹائم ٹیبل میں وقت دیکھا اور اس سے اور بھی اطمینان ہوا کہ گھنٹہ بھر بعد میل ٹرین چھوٹیگی جو اکسپرس کو بینا کے جنکشن پر پکڑ لیتی ہے۔ لہٰذا میں نے طے کر لیا کہ بینا تک جانا چاہیے۔ اور وہاں یہ حضرت اپنی محبوبہ کی زیارت بھی کر لیں گے۔ میں نے ان کو واپس آکر یہ مژدہ سُنایا، مگر وہ تو مجھ کو ہمیشہ کا جھوٹا نہی تو کم از کم اس عشق کے آغاز سے تو جھوٹا ہی سمجھنے لگے تھے' لہذا وہ اس خوشخبری کو بھی ایک غلط تسلی سمجھے، لیکن جب میں نے اُن کے علاوہ اپنی بھی قسم کھائی تو اُن کو ذرا اطمینان ہوا اور اب اُنھوں نے اپنا رُخ بجائے جانے والی گاڑی کی طرف کے آنے والی گاڑی کی طرف پھیر دیا۔ یہ پہلی حرکت تھی جو صبح سے اب تک اُنھوں نے کی، اسکے علاوہ باقی حالات

بدستور رہتے کبھی آہ سرد بھرتے تھے کبھی ع

ترے تیر نیم‌کش کو کوئی میرے دل سے پوچھے

گنگناتے تھے اور کبھی ایک چشم غضب اس ناکردہ گناہ پر بھی ڈال دیتے تھے، ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر ہمارا کیا قصور ہے۔ اگر ہم نے دل لیا ہوتا، یا ہم نے دل لینے والی کو بھڑکا کر اُن کا دل اُڑوا دیا ہوتا یا ہم کسی طرح بھی اس معاملہ میں دخل ہوتا تو ایک بات تھی، لیکن یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم بے خطا ہیں وہ حضرت ہم کو اس طرح دیکھ رہے تھے گویا سب کچھ کیا دھرا ہمارا ہے۔ ہماری ہمدردی ملاحظہ فرمائیے، کہ ہم نے چائے پیش کی لیکن اس کا جواب بجائے شکریہ کے ایک حقارت آمیز چین جبیں سے دیا گیا بلکہ جب ہم نے مع ٹوسٹ کے چائے کی پیالی بڑھائی، تو حضرت اس زور سے جھڑک کر بولے کہ چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی، مجبوراً ہم نے خود چائے پی لی اور چپ ہو کر بیٹھ رہے۔ حالانکہ اُن کو ہر طرح کا اطمینان تھا کہ اب چلیں گے اور وہ نظارہ بھی حاصل ہو جائیگا جس کے لیے وہ پھڑک رہے تھے لیکن تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اُن کا یہ حال ہوتا جاتا تھا گویا کسی سخت قسم کا دورہ شروع ہو گیا۔ اُلجھی ہوئی سانسیں بنا گھبرائی ہوئی آنکھوں سے

ہر طرف اس طرح دیکھتے تھے، گویا کسی کو قتل کر کے بھاگنے کی فکر میں ہیں، کم از کم اُنکی نہ خوفناک صورت دیکھکر میں تو سہم ہی جاتا تھا۔ اُن حضرت کو مجھ سے ایک نئی شکایت پیدا ہو گئی تھی کہ میں ہی گاڑی کی آمد میں تاخیر کا باعث ہوں، کئی مرتبہ ڈانٹ کر مجھ سے پوچھا "گاڑی کب آئیگی"۔ جب میں نے کہا کہ "اپنے وقت پر آئے گی"۔ تو مجھ کو اور بھی کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھکر کہا "اب کیا آئے گی، وہ کیوں آنے لگی"۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ گاڑی نے آکر میری جان بچالی اور اُن کے ساتھ میں بھی گھبرا کر اپنے سامنے والے ڈبہ میں چڑھ گیا جو اتفاق سے اسباب وغیرہ کا ڈبہ نہ تھا آدمیوں ہی کا ڈبہ تھا ورنہ معلوم نہیں اسباب کے ڈبہ میں گھسنا پڑتا یا گارڈ کے ڈبہ میں اس لیے کہ اُنکی وحشت مجھ کو بھی بغیر دل کھوئے ہوئے نیم وحشی بنا چکی تھی۔

(۳)

بمبئی میل کی رفتار سے میرے تخیلات کی رفتار اور میرے تخیلات کی رفتار سے تیز اختر کی وحشت کی رفتار تھی۔ ہم دونوں نہایت خاموشی کے ساتھ ریل کی چھک چھک کے سُروں پر اپنے تخیلات کے نغمے اُتارتے

ہوئے سفر طے کر رہے تھے، کہ یکایک مجھ کو ٹکٹ نہ خریدنے کا خیال پیدا ہوا اور یقین جانیے کہ تمام بدن کا خون جو اختر صاحب کی وحشت سے بچ رہا تھا اس بغیر ٹکٹ سفر کرنے سے خشک ہو گیا۔ لیکن اب ہو ہی کیا سکتا تھا، اگر اختر سے کہتے تو ڈر تھا کہ ہمارے دوسرے ہم سفر نہ سُن لیں، اور ممکن ہے کہ اُن میں کوئی ریلوے ملازم ہو جو ہم کو اگلے اسٹیشن پر ٹکٹ کے دام معہ جرمانہ ادا کرنے کے علاوہ بم سازی کے شبہ میں پولیس کے سپرد کر دے۔ دوسرے یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں اختر زنجیر نہ کھینچ لے کہ بیٹھے بٹھائے پچاس روپیہ جرمانہ ادا کرنے کے لیے ہم کو اپنے اور اختر کے کپڑے بیچنا پڑیں۔ لہٰذا ہم نے خاموش ہی رہنا مناسب سمجھا۔ لیکن صورت تو ایسی ہو گئی گویا اپنے کسی شریک سفر کا لوٹا چرانے کے بعد پکڑے گئے ہوں۔ اور خود اس پر شرمندگی ہم کو سر نہ اُٹھانے دیتی تھی، ہم اسی فکر میں تھے کہ اب کیا ہوگا کہ اختر نے چونک کر پوچھا "کیا بنا آگیا؟"

میں۔ "ابھی کہاں سے آیا یہ تو للیتا پور ہے۔ اب آئیگا بینا۔"

اختر۔ خدا جانے کب آئیگا؟ کیا ہمیشہ اتنی ہی دیر میں بینا آتا تھا، یا آج گاڑی سست چل رہی ہے؟"

میں - "تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو - اب جلدی کیا ہے - اسکے بعد میں بتیا ہی مجھ"
اختر - "آج گاڑی کو یقیناً مجھ سے ضد ہو گئی ہے ورنہ اتنی دیر نہ لگتی، میرا دم
اُلجھ رہا ہے، میں پریشان ہوں مجھ سے وقت نہیں کٹتا"
یہ کہہ کر اختر ایک دم کھڑا ہو گیا - اور میں بھی اس طرح اُنکے ساتھ ساتھ
کھڑا ہو گیا گویا ہم دونوں میں ایک ہی اسپرنگ لگا ہوا تھا - میں نے اختر
سے بیٹھ جانے کو کہا اور معلوم نہیں کیوں اختر نے میری ہدایت پر عمل
کیا، میں بھی بیٹھ گیا، اور اختر کے دل کو ادھر اُدھر کی باتوں سے بہلانے کی
کوشش کرنے لگا - "اختر دہی بڑے کھاؤ گے؟"
اختر - "نہیں"
میں - "للت پور کے دہی بڑے اور پاپڑ تمام ہندوستان میں مشہور ہیں -
اختر - "نہیں"
میں - "نہیں کیا واقعی مشہور ہیں، تم کھا کر تو دیکھو یاد کرو گے مزا"
اختر - "نہیں"
میں - "اچھا پاپڑ کھالو"
اختر - "نہیں"

اب میں نے گفتگو کا رخ بدل کر کہا کہ "تمھارے والد للت پور میں رہ چکے ہیں اور تمھارا بچپن یہیں گزرا ہے۔ جب تم چھوٹے سے تھے اور تم کو ضعف معدہ کی شکایت تھی تو یہاں کے ایک بوڑھے سے حکیم جن کا بھلا سا نام تھا یاد نہیں آتا تمھارے معالج تھے اور انھوں نے تم کو فاقہ پر فاقے دلوائے، تم بہت کمزور ہو گئے تھے اور ہر نیت بھی ہر وقت کھانے کے لیے روتے تھے۔ ہم تو اس وقت بڑے سے تھے اور تم کو بہت چھیڑا کرتے تھے، ایک مرتبہ تمھاری ٹانگوں میں گھس کر جو ہم کھڑے ہوئے تو تم بڑی زور سے گر پڑے اور تمھاری پیشانی پر زخم بھی آ گیا، اس دن تمھارے والد ہم پر بہت خفا ہوئے تھے اور تم سے کہا تھا کہ اس شریر کے ساتھ نہ کھیلا کرو، مگر ہائے بچپن! دوسرے ہی دن پھر اس طرح ہم دونوں گھلے مل گئے، گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ تم کو معلوم ہوتا ہے کچھ یاد نہیں" آخر۔ "نہیں"۔

اب ہم نے دیکھا کہ اس شخص نے "نہیں" کہنے کی قسم کھائی ہے تو اس سے ایسی گفتگو کی جائے کہ یہ "ہاں" بھی کہے تا کہ اس کے بعد کوئی اور امکان پیدا ہو۔ لہٰذا ہم نے ڈھونڈ کر ایسا جملہ کہا کہ "ہاں

کے علاوہ کچھ نہ کہا جا سکے۔

اختر۔ "اونھ"

اب تو ہم اور بھی پریشان ہوئے، کہ یہ "اونھ" تو "نہیں" سے بھی زیادہ خطرناک جواب ہے۔ اس لیے کہ بعد والا درجہ خاموشی ہے لہٰذا ہم کو ذرا فکر پیدا ہو گئی لیکن فوراً ہی ہم کو خیال آیا کہ اُن سے اسی کے متعلق سوال کیے جائیں جس میں یہ کھوئے ہوئے ہیں اور واقعی یہ سوالات ضروری بھی تھے، لہٰذا ہم نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر پوچھا۔

"تم بتاؤ میں اسکو پہچان لو گے"۔

اختر۔ "اُس کو میں یہیں سے پہچان رہا ہوں"۔

میں۔ "یہاں سے تو خیر پہچان رہے ہو مگر وہاں کس طرح پہچانو گے۔ اسکی پہچان کیا ہے؟"

اختر۔ جسکی طرف مجھ کو پھانسی سے کشاں کشاں لایا جارہا ہے وہ بتائیں بھی مجھ کو اپنے قریب کھینچ لیگا۔

میں۔ "مگر مجھ کو تو پہچان بتاؤ کہ کیسی صورت تھی، کیا وضع قطع تھی تاکہ میں بھی پہچان سکوں"۔

اختر۔ ”صورت میں نے دیکھی نہیں بس ایک بجلی سی چمک کر میری آنکھوں کو جھپکا گئی، اور میں تاب نظارہ نہ لا سکا“
میں ”کچھ لباس وغیرہ کے متعلق بتا سکتے ہو“
اختر ”ہاں شاید ریشمی پیازی رنگ کی ساری تھی اور بالوں میں اسی رنگ کا ریشمی فیتہ تھا“
میں۔ ”بظاہر مسلمان معلوم ہوتی تھی یا کوئی اور“
اختر۔ ”کافرہ تھی کافرہ“
میں۔ ”یعنی مسلمان نہیں تھی، اچھا کچھ اور بتاؤ“
اختر ”میں کیا بتاؤں ایک برق مجسم تھی ایک شعلۂ لرزاں تھی، ایک وحدت مطلق تھی، ایک کفر سراپا تھی“
میں ”ان پہچانوں سے تو میرے فرشتے بھی کسی کی شناخت نہیں کر سکتے ایسا پتہ ـــــــــ بینا جنکشن دور سے نظر آنے لگا اور میرے منہ سے نکل گیا کہ بینا آ گیا۔
یہ سنتے ہی اختر اس بیتابی سے کھڑکی میں جھکے کہ مجھکو اُن کا بازو پکڑ لینا پڑا، کہ کہیں گر نہ پڑیں یا چھلانگ نہ ماریں۔

(۴)

مینا کے اسٹیشن پر اختر تو بیتابی کے ساتھ اُتر گئے۔ لیکن ہم کو اپنا پاس
ٹکٹ کا نہ ہونا پھر یاد آ گیا، اور ہم اپنے کو چھپائے ہوئے اُتر پڑے۔ لیکن
بہ یک نیتی دو گوش تھے، لہٰذا یہ جھوٹ بولا جا سکتا تھا کہ ہم مسافر نہیں ہیں
کسی کو سوار کرانا چاہتے ہیں۔ صرف یہی ایک ہمارے بچنے کا امکان تھا۔
گاڑی سے اُتر کر دوسری گاڑی کی تلاش میں چلے، آگے آگے اختر تھے اور
پیچھے پیچھے ہم، اختر تو آنکھیں پھاڑے منہ کھولے ایک طرف کو چلے جا رہے
تھے، اور ہمارا یہ حال تھا کہ جو عورت نظر آتی تھی ہم بڑھ کر اختر سے پوچھ لیتے
تھے کہ "دیکھو یہ تو نہیں ہے"۔ لیکن اختر ہمارے اس سوال کا جواب
دینا بھی غیر ضروری سمجھتے تھے اور بڑھے چلے جا رہے تھے۔ ہم نے اس
بے تکے پن کو ناجائز سمجھ کر ایک قلی سے پوچھ لیا کہ اکسپریس کہاں ہے۔ اور
صحیح پتہ معلوم کرنے کے بعد اختر کو لیکر دوسرے پلیٹ فارم پر پہنچے جہاں
اکسپریس موجود تھی، اختر نے بیتابی کے مارے دو تین سیڑھیاں اُترنا بھی
مناسب نہ سمجھا اور ریلنگ کو پکڑ کر اس طرح پھاندے کہ اگر ذرا ہم نہ سنبھالتے تو
خود مع اختر کے ایک پان والے پر اس طرح گرتا کہ منہ ٹوٹ جاتا ورنہ پان والا

توڑ دیتا۔ چلتے چلتے اختر ٹھہر گیا اور میرے کان کے پاس مُنہ لا کر کہنے لگا
"وہ ہے میرا مرکزِ نظر وہ ہے"

مَیں نے بھی اُسکی اُنگلی کی سیدھ میں بندوق کے نشانہ کی طرح شست باندھ کر دیکھا، تو ایک پیازی رنگ کی ساری میں لپٹی ہوئی نازنین کی پشت دکھائی دی، جس پر لمبے لمبے ریشمی بال ایک پیازی رنگ کے فیتے سے بندھے ہوئے ہوا کے جھونکوں سے بل کھا رہے تھے اور ساری میں ہوا نے ایک تموجی کیفیت پیدا کر دی تھی، وہ نازنین ایک سکنڈ کلاس میں بیٹھی تھی، اور بظاہر یا تو پارسن تھی یا عیسائن۔ میں دیر تک اُسکو دیکھتا رہا۔ اختر کا تو وہی حال ہو گیا جو جھانسی کے اسٹیشن پر تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کو نصب کر دیا گیا ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ کیا اس شخص کی آنکھیں بھی پتھر کی معلوم ہوتی تھیں۔ کیا مجال جو ایک مرتبہ بھی جھپکی ہوں۔ جب اسی عالم میں کافی دیر ہو گئی تو میں نے کہا۔

"اب جا کر قریب سے دیکھ لو، نہیں تو ریل چھوٹ جائیگی۔"

اختر ... "ہوں۔"

مَیں ... "ہوں کیا، دیکھنا ہے تو دیکھ بھی لو، صورت ہی نہ دیکھی

تو کیا دیکھا"

اختر۔ "مگر میں دیکھ نہ سکونگا۔ بغیر دیکھے میرا یہ حال ہے۔ شاید دیکھکر میں زندہ نہ رہ سکونگا"

میں۔ "نہیں دیکھو، چلو میں بھی چلتا ہوں۔ اُدھر سے دیکھیں گے"۔

اختر خود تو نہیں چلے، چلائے گئے۔ میں نے اُنکا بازو پکڑکر آگے بڑھا دیا، اور وہ ڈگمگاتی ہوئی چال سے آگے بڑھے ہم دونوں چکر کاٹ کر اُس رُخ پر پہونچے جدھر اختر کی مطلوبہ کا رُخ روشن تھا، لیکن اُدھر سے جاکر دیکھا تو اُدھر بھی پشت ہی تھی، غالباً اس عرصہ میں اُس نے اپنا رُخ بدل دیا، یا اُسکے دونوں رُخ یکساں تھے، بہرحال ہم دونوں پھر اپنی پہلی جگہ پر واپس آگئے۔ اس مرتبہ اُسکا رُخ ہماری ہی طرف تھا لیکن میں نے غیرارادی طور پر گردن جھکالی، غالباً اس لئے کہ پرائی چیز تھی۔ اور اختر نے اس لئے آنکھیں چار نہ کیں کہ کلوروفارم کے اثرات کا اندیشہ تھا۔ لیکن میری گردن ایکدم سے اختر کے "ارے" کہنے سے اوپر اُٹھی، اب جو دیکھتا ہوں تو ایک پچپن سالہ بڑی بی چیچک کے نقشیں

چہرے کو ہماری طرف اُٹھائے نہایت محبت سے دیکھ رہی تھیں
مجھ پر ایک سکتے کا عالم طاری ہو گیا اور غالباً اختر کی روح قفسِ عنصری
سے عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی ہو گی۔ دیر تک ہم دونوں مُنہ کھولے
ایک دوسرے کو اس طرح دیکھتے رہے جیسے آپس میں ایک دوسرے
کی نقل اُتار رہے ہیں۔ اور جب ہوش بجا ہوئے تو دونوں ایک
دوسرے کی طرف اس طرح پیٹھ موڑلی گویا۔ ع

تم اپنا مُنہ ادھر کر لو ہم اپنا مُنہ ادھر کر لیں

کی مشق کر رہے ہیں۔ میں نے احتیاطاً پھر اُن بزرگ کے قریب جا کر
اُن کو اس لیے دیکھا کہ کہیں یہ کوئی اور نہ ہوں۔ لیکن در اصل یہ
وہی برقِ مجسّم، وہی شعلۂ لرزاں، وہی وحدتِ مطلق اور وہی
کفرِ سراپا تھیں، جن کے لیے ہم یہاں آئے تھے۔ اختر کا یہ حال تھا
کہ ایک چُپ لگ گئی تھی، میرے سامنے مُنہ بھی نہ کرتا تھا۔ اور
مجھ کو اختر کے "ہمدلوپن" پر ایسا غصہ آ رہا تھا کہ اگر اپنی اولاد
ہوتی تو عاق کیے بغیر نہ چھوڑتا مگر "دیوانہ تو دیوانہ" کرتے تو کیا
کرتے۔ آخر میں نے بھی سوائے اس کے اور کچھ نہ کہا کہ "دل دینے سے

پہلے دیکھ لینا چاہیے کہ کس کو دیا جا رہا ہے اور عشق کرنے کے لیے
تعین عمر لازمی ہے "
اختر نے اپنا منہ آسمان کی طرف اُٹھا کر پیٹھ موڑ لی - اور
بس واپسی کے لیے ٹرین کا وقت دیکھنے ٹائم ٹیبل کی تلاش میں
بک اسٹال کی طرف چل دیا۔ معلوم نہیں کہ ایکسپریس کب چھوٹی۔

اڈیٹر
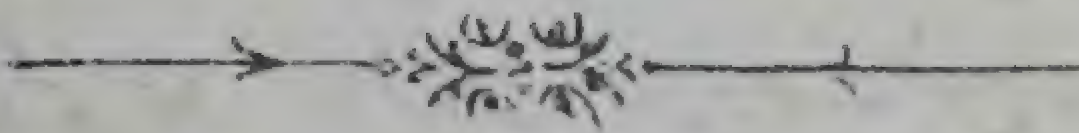
ایڈیٹر

اِس سے قبل کہ میں اس جنس کے متعلق کچھ عرض کروں ضرورت اس کی ہے کہ میں خود اپنی پوزیشن بھی واضح کردوں کہ خود میں بھی ایڈیٹر رہا ہوں - ایڈیٹر ہوں اور چونکہ ایڈیٹری کرنے کے بعد ایک آدمی دوسرے مشاغل کے لیے بیکار ہو جاتا ہے اور دنیا میں رہ کر سوائے ایڈیٹری کرنے کے اور کچھ نہیں کرسکتا، لہٰذا بظاہر تو یہی اُمید ہے کہ آیندہ بھی ایڈیٹر ہی رہنا پڑیگا - ایسی صورت میں دوسرے ایڈیٹر صاحبان کو اس مضمون پر ناک بھوں چڑھانے کی زحمت نہ اُٹھانا چاہیے بلکہ یہی سمجھنا چاہیے کہ ایک گھر کا بھیدی لنکا ڈھا رہا ہے

بہ حیثیت ایک ایڈیٹر کے یہ خاکسار ایڈیٹران ملک و ملت کے متعلق جس رائے پر پہونچا ہے وہ یہ ہے کہ ایڈیٹر دراصل اُس حیوان ناطق کو

کہتے ہیں جس پر آسانی کے ساتھ حیوان مطلق کا شبہ ہو سکے بلکہ بعض اوقات تو وہ نہ حیوان ناطق معلوم ہوتا ہے نہ حیوان مطلق۔ البتہ اسکو ایک ایسی مشین سمجھا جا سکتا ہے جو میز سے ٹکا کر کرسی پہ رکھدی گئی ہو اور جس میں کچھ اس قسم کی کوک بھر دی گئی ہو کہ بس لکھتا رہے۔ اور جس طرح ایک مشین کو اس کی فکر نہیں ہوتی کہ اسکے کس حصہ پہ گرد پڑی ہے اور وہ کتنا کام کر چکی ہے، اسی طرح یہ مشین بھی اس سے قطعاً خالی الذہن رہتی ہے کہ اسکی کیا گت بنی ہوئی ہے، کپڑے میلے ہیں یا اجلے، خط بڑھا ہوا ہے یا نہیں، بدن پر کس حد تک میل جم چکا ہے اور صورت سے انسانیت کس قدر غیر متعلق ہو چکی ہے، بس اسکو تو اسی سے کام ہے کہ لکھے اور لکھے جائے اور اس وقت تک لکھنے سے باز نہ آئے جبتک کہ اخبار لکھنے والے کاتب چیخ نہ اٹھیں کہ للہ اب قلم کو روکو۔ آپ کو اگر یقین نہ آتا ہو تو کسی ذمہ دار اخبار کے دفتر میں جا کر دن کو یا رات کو یہ تماشہ دیکھ سکتے ہیں کہ ایڈیٹر صاحبان آپ کو کرسی پر لٹکے ہوئے ملیں گے اور اگر وہ واقعی ایڈیٹر ہیں تو ان کی صورت سے آپ کو بھی اندازہ ہو گا کہ کوئی حبس دوام کا قیدی بیٹھا ہوا چکی پیس رہا ہے۔

اس خاکسار کو سب سے پہلے جن ایڈیٹر صاحب سے واسطہ پڑا وہ اُستادی سید جالب دہلوی مرحوم و مغفور تھے جو روزنامہ "ہمدم" لکھنؤ کے چیف ایڈیٹر تھے اور یہ خاکسار بہ حیثیت ایک رُکن ادارہ کے صحافت کے اُس باوا آدم کے پاس اخبار نویسی کا قاعدہ بغدادی پڑھنے کو بٹھایا گیا تھا۔ سید جالب مرحوم کو اُردو صحافت میں جو درجہ حاصل تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں مگر اسکے ساتھ ساتھ ذرا اس بزرگِ محترم کی وضع قطع بھی ملاحظہ فرمایئے کہ کیا تھی۔ آپ کے سر پر انگریزی بال تھے جو کبھی محتاج شانہ نہیں ہوئے اور ہمیشہ بے ترتیبی کے ساتھ بکھرے رہتے تھے۔ ان بکھرے ہوئے بالوں پر ترکی ٹوپی بھی اس طرح زیب سر کی جاتی تھی کہ بال ہر طرف سے نکلے ہوئے ہیں اور ٹوپی بھی متعدد جگہ سے پچکی ہوئی سر پر رکھی ہوئی ہے۔ پھندنا آگے لٹک رہا ہے اور پھندنے کے آگے سفید بالوں کا ایک دو گچھا موجود ہے۔ شیروانی کا یہ حال کہ اوّل تو نصف کے قریب بٹن لگائے ہی نہ جاتے تھے، اور جو لگائے جاتے تھے وہ اس طرح کہ نیچے کا بٹن اوپر کے کاج میں لگا دیا تو اوپر کا بٹن مجبوراً نیچے کے کاج میں لگانا پڑتا تھا اور

عموماً نیچے کے بٹن اس طرح کھلے رہتے تھے کہ وہ شیروانی ہمیشہ پھیلائے رہتی تھی، پاجامہ کا کون سا پائینچہ اونچا ہے اور کون سا نیچا، اس کی کبھی آپ کو خبر نہ ہوتی تھی۔ البتہ ازاربند کو اکثر لٹکنے سے روکا جاتا تھا حد تو یہ ہے کہ جب سید جالب صاحب "ہمدم" سے مستعفی ہوئے اور اُن کی رخصتی پارٹی کے موقع پر گروپ لینے کا انتظام کیا گیا تو آپ نے لباس کی طرف غیر معمولی توجہ فرما کر ذرا ٹوپی بھی ٹھیک سے پہن لی تھی اور شیروانی کے بٹن بھی آج پہلی مرتبہ باقاعدہ لگے ہوئے تھے لیکن جوتے کی ڈوریاں آج بھی کھلی ہوئی تھیں۔ قاضی حامد صاحب سب ایڈیٹر نے فرمایا کہ "میر صاحب جوتے کی ڈوریاں کھلی ہوئی ہیں" اس خاکسار نے کہا: "حاجتِ مشاطہ نیست" اور جالب صاحب کے خلف رشید نے بغیر سوچے سمجھے اس مصرعہ کو مکمل کر دیا کہ "روے دل آرام را" خیر، یہ تو باپ بیٹے کا باہمی مذاق تھا، ہم سے کیا مطلب؟ مگر مطلب کہنے کا یہ ہے کہ سید جالب صاحب چونکہ صحیح معنوں میں ایڈیٹر تھے لہذا یہ تھی اُنکی ہیئت جو ہم نے عرض کی۔

اس سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ تمام ایڈیٹر ایسے ہی ہوتے ہیں

یا جو کوئی بھی ایڈیٹری کرنے چلے اُسکو ایسا ہی ہو جانا چاہیے۔ جی نہیں بلکہ ہم نے اگر ایک طرف اس قسم کے "ہمہ تن ایڈیٹر" دیکھے ہیں تو ایسے ایڈیٹر صاحبان بھی ہماری نظروں سے گزرے ہیں جو یوٹ سوٹ سے لیس ہوں اور جن کے قریب سے گزر جانے والا انسان ایک ہفتہ تک لونڈر سے مہکتا رہے لیکن ہم یہ سمجھنے سے ضرور قاصر ہیں کہ یہ حضرات ایڈیٹری کے فرائض کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اپنے بناؤ سنگار کی تکمیل کے لیے کہاں سے وقت نکالتے ہیں اس لیے کہ وہ ایڈیٹر جو واقعی ایڈیٹر ہیں اور کسی واقعی اخبار کے ایڈیٹر ہیں ان کو تو در اصل اتنی بھی مہلت نہیں ملتی کہ وہ کسی وقت اپنے انسان ہونے کے متعلق غور کر سکیں، ان کو تو شب و روز اسی کی فکر رہتی ہے کہ دن کو ڈاک کے وقت کے اندر کسی نہ کسی طرح مر کھپ کر ڈاک ایڈیشن تیار کرا دیں اور رات کو شب فرقت کی طرح آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ کر لوکل ایڈیشن ترتیب دیں۔ اسکے بعد جب ایک آدھ گھنٹہ کے لیے سونے کا موقع ملے تو یہ خواب دیکھیں کہ کاپی جڑ دار آ رہے ہیں اور کھانے پینے کی فرصت کے وقت یہ سوچیں کہ آج ہم کو اپنے

ادارتی مقالہ میں بہار رلیف فنڈ کی قلعی کھولنا ہے اور اپنے مزاحیہ کالم میں مسٹر چرچل کی خیریت مزاج دریافت کرنا ہے خواہ اس غور و فکر کے انہماک میں نوالہ مُنہ میں جائے یا ناک میں۔ ایسی حالت میں آپ خود ہی بتائیے کہ کسی ایڈیٹر کو سولہ سنگار کرنے اور بن ٹھن کر کرسیِ ادارت پر اپنے حُسن جہاں سوز کی نمائش کرنے کا موقع کس طرح مل سکتا ہے۔

واضح رہے کہ ہمارا مقصد صرف اُن روزانہ اخبارات سے ہے جو باقاعدہ قسم کے روزانہ اخبارات ہیں اور جن کے دفاتر میں نہ صرف دن کو چہل پہل رہتی ہے بلکہ رات کو بھی "رتجگا" ہوتا ہو۔ اور جن کے ارباب حل و عقد کو شب و روز اسی قسم کے تاروں کا انتظار رہتا ہو کہ کہاں گولی چلی، کس جگہ آسمان ٹوٹ پڑا۔ کون سا مشہور آدمی مرا۔ کہاں ریل لڑی اور دُنیا کے کس حصہ میں قیامت آگئی۔

اس قسم کے خالص ایڈیٹروں کے علاوہ آپ کے ہندوستان میں سیکڑوں قسم کے اور ایڈیٹر بھی پائے جاتے ہیں اور ان ایڈیٹروں کے لیے یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ وہ بھی انسانیت سے اسی طرح

بنز رہوں جس طرح میچ کے ایڈیٹر ہوا کرتے ہیں بلکہ وہ حیثیت
سے مکمل انسان بلکہ اکثر غلمان ہوا کرتے ہیں اور بعض جینے کے
لیے اپنے نام کے آگے ایڈیٹر بڑھا لیتے ہیں۔ اس قسم کے ایڈیٹروں
کی تعداد آپ کو ہندوستان کی مردم شماری سے ملتی جلتی ملے گی اور
اگر آپ اس سلسلہ میں تحقیقات کرینگے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بہت سے
حضرات تو محض اس لیے ایڈیٹر بن گئے کہ انھوں نے انٹرینس کے
امتحان میں فیل ہو کر ڈپٹی کلکٹری سے لے کر ریلوے کی ٹکٹ چیکری
تک کے لیے، اور میونسپل بورڈ کی کلرکی سے لیکر پولیس کی کانسٹبلی
تک کے لیے جب تمام کوششیں کریں اور ہر کوشش میں جھک مار چکے
تو مجبوراً صرف اسی طرف متوجہ ہونا پڑا کہ یا تو بساطی کی دوکان کھولیں
ورنہ کوئی اخبار نکال دیں اور چونکہ اخبار کا ایڈیٹر بننا بساطی بننے سے
اعزاز کی بات تھی لہذا وہ ایڈیٹر بن گئے ہیں اور ایک ایسا ہفتہ وار
اخبار جاری کر دیا ہے جو کسی سہ ماہی رسالہ کا لطف دے کسی ایڈیٹر
سے اس کی ایڈیٹری کا سبب پوچھیے تو وہ صاف صاف یہی بتائیگا
کہ ایڈیٹروں کے پاس دعوتوں کے کارڈ بہت آتے ہیں۔ کوئی ایڈیٹر صاحب

محض اس لیے ایڈیٹر بن گئے ہیں انکو اپنی سمن حاصل کرنے کی قابلیت پر
پورا پورا اعتماد تھا لہذا اُنھوں نے ایک "سمن بغرض انفصال مقدمہ"
قسم کا اخبار جاری کر دیا ہے اور اپنے سمنی اغراض و مقاصد کے لیے ایڈیٹر
بنے ہوے ہیں - بہت سے ایسے ایڈیٹر ہیں کہ اُن کے اخبار گھربار کا مقصد
صرف یہ ہے کہ تھیٹر اور سینما کے اشتہارات مفت شایع کیا کریں اور
صرف پاس حاصل کرنے کے لیے ایڈیٹری کو اپنا پیشہ بنائیں - ہم نے
اپنے ایک دیرینہ کرم فرما سے جو کسی ٹیلرنگ شاپ کے مالک تھے اُنکو
ایک ماہوار رسالہ کا ایڈیٹر دیکھ کر پوچھا کہ "ارے تم ایڈیٹر ہو گئے" اُس
بیچارے نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ بھائی اور کیا کرتے؟ اسکا مقصد
یہ ہوا کہ وہ لوگ ایڈیٹری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو دُنیا میں کچھ اور
کر ہی نہیں سکتے، حالانکہ ایک آدھ پرچہ نکالنے کے بعد جب اُن کو
باحسرت و یاس اس ایڈیٹری کی دوکان کو بھی بند کرنا پڑتا ہے
اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ ایڈیٹر بننا ٹیلر ماسٹر بننے سے کہیں زیادہ
خطرناک ہوتا ہے - بہر حال آپ کے ہندوستان میں صحافت بہ حیثیت
فن کے نہ سہی مگر بہ حیثیت پیشہ کے ماشاء اللہ دن دونی رات چوگنی

ترقی کر رہی ہے اور بھانت بھانت کے ایڈیٹر ڈھل رہے ہیں۔
"لندن آفس" قسم کے ان اعزازی ایڈیٹروں کو چھوڑ دیجئے جو ملاح درچین و کشتی در فرنگ کے مصداق دنیا کے ایک گوشہ میں خود ہوتے ہیں اور دوسرے گوشہ میں شائع ہونے والے رسالہ کے سرورق پر ان کا نام نامی اسم گرامی نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ اگر اس قسم کے ایڈیٹروں کو بھی آپ نے اپنی فہرست میں شامل کر لیا تو اس فہرست کے اعداد و شمار مردم شماری کے اعداد و شمار سے بھی بڑھ جائیں گے۔ آپ ان ایڈیٹروں سے قطع نظر فرما کر صرف اُن ہی ایڈیٹروں کو دیکھیے جو اپنی کرسی ادارت پر ذمہ داری کے ساتھ خود رونق افروز ہیں۔ ان ایڈیٹروں میں خدا جانے آپ کو کس کس قسم کے ایڈیٹر ملیں گے۔ بہرحال ہم کو تو ایسے بھی ایڈیٹر ملے ہیں جن سے ملنے کے لیے ہم بڑی عقیدت سے گئے اور اُن کے دفتر میں پہونچ کر مصلح سنگ سے دریافت کیا کہ ایڈیٹر صاحب کہاں ہیں؟ تو مصلح سنگ صاحب نے لنگی سے ہاتھ پونچھتے ہوئے فرمایا کہ "فرمائیے یہی خاکسار ہے۔" آپ ہی بتائیے کہ ہم کو مصلح سنگ کے اس جواب پر کیونکر

یقین آسکتا تھا، لیکن جب متعدد مرتبہ سوال کرنے کے بعد ہم کو یہ یقین دلا دیا جائے کہ یہی شخص ایڈیٹر ہے جو بظاہر مصلح سنگ نظر آرہا ہے تو اس وقت قدرتی طور پر ہمارا دل خود کشی کرنے کو چاہیگا یا نہیں، مگر ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم کو اس ہندوستان میں ان مصلح سنگ صاحب سے بھی زیادہ شاندار قسم کے ایڈیٹروں کی توقع ہے۔ لہذا ہم کو حیران ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی یہ بیچارہ تو صرف اسی قدر کرتا تھا کہ " خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گِل کوزہ " کے زرین اصول پر چل کر خود ہی لکھتا تھا، اس کے بعد خود ہی خوشنویس کے فرائض انجام دیتا تھا، خود ہی اصلاح سنگی کی خدمت انجام دیتا تھا اور آخر میں خود ہی اپنا ہینڈ پریس چلا کر وہ اخبار تیار کر لیتا تھا جو اسکو بجائے خوشنویس یا مصلح سنگ کے دُنیا کی نظروں میں ایڈیٹر بنائے ہوئے ہے۔

رہ گئے اس قسم کے ایڈیٹر جن کی وجہ سے قانون مطابع روز بروز سخت ہوتا جاتا ہے اور جن کے لئے جیل کا دروازہ ہمیشہ کشادہ رہتا ہے، وہ ذرا کم پائے جاتے ہیں۔ اور یہ واقعہ بھی ہے کہ اگر

ایڈیٹری کر کے جیل ہی جانا ہے تو ایڈیٹری کے بجائے چوری کیوں نہ کرے جس سے کم سے کم جیل جانے کا معاوضہ تو مل جاتا ہے، یہ کیا کہ ملک وقوم کا تمام درد سمیٹ کر اپنے دل میں رکھ لیا اور اس درد کا اظہار اپنے اخبار میں اس طرح کیا کہ

دھرے گئے دل خانہ خراب کے بدلے

ایڈیٹری اس لیے کرنا کہ جیل میں چکی چلانا پڑے یا ضمانت میں باپ دادا کی کمائی سے لے کر بیوی کا جہیز تک نیلام چڑھ جائے۔ ہمارے خیال میں ایڈیٹری کرنا تو نہیں شامت بلانا ہے۔ اور یقیناً اس حیثیت سے وہ لوگ مزے میں ہیں جو اس طرح اپنی جان کھپانے کے بجائے "ایڈیٹر کا نامہ نگاروں کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں"، کے اصول پر چل کر بس اس قسم کے مضامین سے اپنا اخبار بھر دیتے ہیں کہ سمن پیدا نہ ہوں اور اتنے سمن ہر اشاعت کے لیے مل جایا کریں کہ بال بچے بھوکے نہ رہیں، یہ نہیں کہ اخبار کی وجہ سے اپنی زندگی

مستقل عذاب بنالی جائے۔ یقین نہ آتا ہو تو دھرمپال صاحب گپتا سے پوچھ لیجیے کہ وہ کتنے دنوں سے پوری نیند سونے کے لیے ترس رہے ہیں۔

السلام علیکم

السَّلَامُ عَلَیکُم

یاد آیا میکہ السلام علیکم، مسلمانوں کا شرعی سلام تھا لیکن اب تو اسکا وجود صرف تین جگہ ہے۔ علیگڈھ کالج میں، مسجدوں میں اور جولاہوں کے یہاں، خدا جانے دنیائے اسلام کے مرکز عرب میں السلام علیکم کا کیا حال ہے۔ لیکن اگر ہندوستان میں علیگڈھ کالج کو چھوڑ کر مسجدوں کے علاوہ اور جولاہوں کو نظر انداز کردینے کے بعد آپ السلام علیکم کو کہیں تلاش کریں تو آپ کی جستجو ناکام رہیگی۔ خدا بھلا کرے سر سید علیہ الرحمہ کا کہ اُنھوں نے علیگڈھ کالج کی بنیاد السّلام علیکم پر رکھی تھی اور آج اگر کہیں اس اسلامی سلام کا دور دورہ ہے تو علیگڈھ کالج میں۔ یہ اور بات ہے کہ علیگڈھ کالج میں کثرت استعمال سے السلام علیکم بگڑتے بگڑتے "ساما لیکم" ہوگیا۔ لیکن اگر آپ اسکے جواب میں "وعلیکم السلام" کو

ڈھونڈھنا چاہیں تو علیگڈھ کالج میں بھی اسکا پتہ نہ چلیگا۔ وہاں تو بس "سامالیکم" ہے کہ سلام بھی اسی سے کیا جاتا ہے اور جواب بھی اسی سے دیا جاتا ہے۔ آپ کالج کے کسی گوشہ میں چلے جائیے آپ کے نزدیک سے، آپ کے سامنے سے، آپ کے پیچھے سے، آپ کی بغل سے جتنے طلبہ، ماسٹر، پروفیسر، چپراسی، دھوبی، نائی، باورچی، پوسٹ مین جو کوئی بھی گزریگا اس زور سے منہ کھولے بغیر "سامالیکم" جھاڑیگا کہ اگر آپ اجنبی ہیں تو گالی سمجھیں گے اور آپ کا دل چاہیگا کہ "تو خود سامالیکم" کہدیں لیکن تھوڑی ہی دیر میں اس سامالیکم کی ایسی دھواں دھار بارش ہوگی کہ آپ اس ژالہ باری کے عادی ہوجائیں گے۔ اور لطف یہ ہے کہ اگر آپ "سامالیکم" کا تماشہ دیکھنا چاہیں تو آپ کو بڑا مزہ آئیگا۔ جب آپ دیکھیں گے کہ ہر شخص ایک دوسرے سے "سامالیکم" کہتا ہے اور جس زور سے کہنے والا سامالیکم کہتا ہے بالکل اسی آواز میں جواب دینے والا "سامالیکم کہتا ہے گویا اپنے اوپر آئی ہوئی بلا فوراً واپس کردی یا فٹبال کو اسی طرف ٹھوکر مار کر روانہ کردیا۔ جدھر سے وہ لڑھک کر آیا تھا یہانتک کہ تھوڑے ہی دنوں میں آپ کے کان اس "ہنگامہ سامالیکم" کے ایسے

عادی ہو جائینگے جیسے خاموش فضاؤں میں جھینگر کی آواز کے عادی ہو جاتے ہیں۔ خیر وہ "سا مالیکم" سہی۔ لیکن شکر ہے کہ علیگڈھ کالج کے "گڈ مارننگ والوں" میں اسکا رواج ہے۔ یہ سچ ہے کہ وعلیکم السلام وہاں سے بھی ختم ہو چکا لیکن یہی کیا کم ہے کہ "سا مالیکم" ابھی تک وہاں موجود ہے، خدا اسکو باقی رکھے۔ مسجدوں کے ذکر کو چھوڑیے۔ اس لیے کہ وہاں "السلام علیکم" کیا بہت سی باتیں بفضلہ موجود ہیں یہاں تک کہ وعلیکم السلام وہاں سے غائب نہیں ہوا ہے۔ بلکہ ہمارا تو یہ خیال ہے کہ اگر مسجدیں خدانخواستہ نہ ہوتیں اور پانچ وقت کی نماز ادا کرنے کے سلسلہ میں گنتی کے چند مسلمان وہاں نہ جاتے ہوتے تو یہ السلام علیکم آج کسی کو یاد بھی نہ ہوتا۔ دن بھر میں کم سے کم پانچ مرتبہ رٹنے کے بعد تو یہ حال ہے کہ مسلمان بجائے یاد رکھنے کے السلام علیکم کو بھولے جاتے ہیں اور اسکی جگہ آداب، تسلیمات، وغیرہ سب کو یاد ہیں لیکن تعجب ہے کہ جولاہوں میں "السلام علیکم" علیگڈھ کالج کے "سا مالیکم" میں ایک "لام" کے اضافہ کے بعد اب تک رائج ہے اور وہ بیچارے ابھی تک "سلا مالیکم" کہتے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ صرف نور بافوں ہی کی قوم ایسی رہ گئی ہے جو اپنے کو مسلمان سمجھتے ہیں، ورنہ ہم کو یہ وہم ہو گیا ہے کہ شاید

مذہب اسلام نام ہے جولاہے پن کا۔ کہ وہ جتنی حرکتیں کرتے ہیں سب کو شرع اسلام کے عین مطابق سمجھتے ہیں۔ یہ بیچارے نیک نہاد ہوتے ہیں سیدھے سادھے ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ صرف جولاہوں کے دم سے اسلام کا چراغ روشن ہے۔ خیر ان کے سمجھنے سے یہ تو ہوتا ہے کہ "مسجد میں جمعۃ مل جاتے ہیں۔ ورنہ کوئی بھی نہ ہوتا۔ اس لیے کہ جس طرح جولاہے اسلام کو اپنا اور صرف اپنا سمجھتے ہیں۔ مسلمان صرف اپنے کو سمجھتے ہیں۔ نماز صرف اپنی سمجھتے ہیں، اسی طرح غیر جولاہے بھی تو نماز روزے کو جولاہاپن سمجھنے لگے ہیں اور ہمارے نزدیک تو یہی راز ہے "السلام علیکم" کے متروک ہونیکا کہ لوگوں نے اسکو جولاہوں کا سلام سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔ اور جولاہے اپنے "سلاما لیکم" کو عادتاً اختیار کیے ہوئے ہیں۔ نہ تو کہیے کہ جولاہوں میں یہ بات اچھی ہوتی ہے کہ جو عادت پڑ جاتی ہے مشکل سے چھوٹتی ہے ورنہ السلام علیکم صرف مسجدوں اور علیگڈھ کالج میں رہ جاتا۔ علیگڈھ کالج میں ڈھیلا مارنے کی طرح اور مسجد میں بم کی آواز بن کر لیکن شکر ہے کہ جولاہے حقہ کی طرح "سلاما لیکم" کے بھی عادی ہیں۔
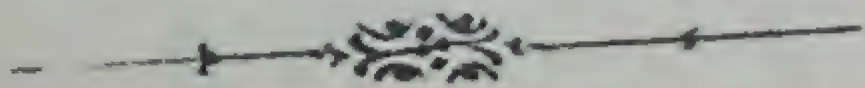
بس جھانسی تک

بس جھانسی تک

لکھنؤ سے کانپور اتنا ہی دور ہے جتنا کانپور سے لکھنؤ اور جھانسی ایکسپرس انکا درمیانی راستہ گھنٹہ سوا گھنٹہ میں طے کر لیتی ہے۔ لیکن آپ کے ملا رموزی صاحب کو خدا نے کبھی یہ توفیق نہ دی کہ جب وہ بھوپال سے ذرا کانپور تک آئیں تو لکھنؤ بھی ہو لیں۔ بھوپال سے چل کر کانپور تک آنے والا اور بغیر لکھنؤ آئے لوٹ جانے والا بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے بمبئی سے لوٹ آنے والے حاجی ہوتے ہیں۔

ہم کو ملا رموزی کی یہ حرکت بالکل ملاؤں کی ایسی معلوم ہوئی اور اور ہم نے ذرا غضبناک ہو کر فیصلہ کر لیا۔ کہ اگر بمبئی بھی جانا ہو گا تو چاہے ہم کو حسنہ دہلی کے راستے کیوں نہ جانا پڑے مگر بھوپال کی طرف سے تو نہ جائیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ جھانسی جانے کا اتفاق ہوا مگر ہم نے

بھوپال کی طرف مُڑ کر بھی نہ دیکھا، حالانکہ ادھر بھی یہی حال ہے کہ جتنا بھوپال جھانسی سے دُور ہے اتنا ہی جھانسی بھوپال سے فاصلہ پر ہے البتہ راستہ چھ سات گھنٹہ کا ہے، اگر ہم چاہتے تو ادھر بھی ہو لیتے مگر ہم کو انتقام لینا تھا۔ لہٰذا گئے جھانسی تک اور واپس آ گئے۔

ہم تو جھانسی کبھی نہ جاتے مگر یہ آپ کے حامد شاہجہانپوری صاحب جو ہیں اُنھوں نے ہندوستان کے تمام پُر فضا مقامات میں جھانسی کو منتخب کر کے وہیں سکونت اختیار کر لی ہے۔ سکونت تک تو پھر بھی خیر کوئی مضائقہ نہ تھا، جی نہیں ملازمت بھی اختیار کر لی ہے۔ لہٰذا وہ حضرت وہاں اس طرح رہتے سہتے ہیں، گویا رانی جھانسی کے خاص عزیزوں میں ہیں اور محض مذاق میں اپنے کو شاہجہانپوری لکھتے ہیں۔ ان حضرت کو ہم اپنا بڑا بھائی سمجھتے ہیں، حالانکہ ہم دونوں کا بچپن بھوپال میں جہاں اب ملا رموزی صاحب کا دولت خانہ ہے، اس طرح گزرا ہے کہ ہم دونوں آپس میں نہایت محبت سے کھیلتے تھے، اور کھیلتے کھیلتے ایک دوسرے کا مُنہ نوچ لیا کرتے تھے اور پھر دونوں مل کر ایک گاؤ تکیہ کو چچا میاں کی شیروانی پہنا کر، پگڑی باندھ کر بالکل چچا میاں بنا کو بٹھا دیتے

تھے۔ تاکہ باہر سے آنے والے اِس گاؤ تکیہ کو نہایت ادب سے سلام کریں لیکن اکثر خود اصلی چچا میاں کو بھی اپنے مجسمہ کی سلامی اُتارنا پڑتی تھی اُس وقت تو خیر بڑائی چھوٹائی کا خیال نہ تھا لیکن اب چونکہ ہم اُن سے دو سال عمر میں "برادرِ عزیز" ہیں۔ لہٰذا وہ ہم کو شوکت بھائی کہتے ہیں اور چونکہ وہ ہم سے دو تین سال عمر میں "برادرِ محترم" ہیں۔ لہٰذا ہم اُن کو حامد بھائی کہتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم غلطی پر ہیں یا وہ۔ اسکا فیصلہ وہ حضرات بھی کر سکتے ہیں جو کسی کے "برادرِ عزیز" ہیں۔ اور وہ حضرات بھی کر سکتے ہیں جن کو خدا نے "بھائی صاحب قبلہ" بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم کو حامد بھائی کہنا ہی چاہیے تھا۔ لیکن اُنکا شوکت بھائی کہنا ذرا غور طلب ہے۔ از روے قاعدہ تو ہم شوکت کہلانے سے زیادہ کے مستحق نہیں ہیں۔ لیکن اگر وہ بھائی بھی کہتے ہیں تو اس میں ہمارا کیا نقصان۔ ان ہی کو لوگ کہیں گے کہ "بڑا شریف آدمی ہے۔" ہاں تو وہ ہمارے حامد بھائی مع بھابی صاحبہ کے جن کو ہم نے اس سفر کی تقریب میں "انیس حامد" کے معزز خطاب سے سرفراز فرمایا ہے، اسی جھانسی میں رہتے ہیں جس کا ذکر ہم کر رہے ہیں۔ اتفاق سے انیس حامد بھی

شاہجہانپوری ہیں لیکن وہ بیچاری چونکہ شاعرہ نہیں ہیں لہذا انکو اس وقت تک ہندوستان میں سوائے حامد بھائی کے اور کوئی نہیں جانتا حامد بھائی کا شاہجہانپوری ہونا اور نہ ہونا سب یکساں ہے۔ لیکن انیس حامد کی وطن پرستی اُن کو بھی کبھی کبھی ادھر کھینچ لاتی ہے اور شاہجہانپور جانے والے حامد بھائی لکھنؤ کے اسٹیشن پر ہم سے بھی مل لیا کرتے ہیں۔

اگر ہماری سسرال بھی دتیا، گوالیار وغیرہ میں ہوتی تو ہم بھی اسی طرح جھانسی سے گزرا کرتے لیکن ہم کوئی فرہاد کے خاندان سے تو ہیں نہیں کہ پہاڑی ممالک میں سسرال بناتے۔ لہذا ہم تو اس سے محروم ہی رہ گئے۔ لیکن حامد بھائی کا قیام جھانسی اور لکھنؤ سے گزرنا ہمارے سفر جھانسی کی بنیاد بن گیا۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے "جھانسی آؤ۔" ہم نے بھی گردن ہلادی۔ بس اُنھوں نے اس گردن ہلانے سے اتنا فائدہ اُٹھایا کہ جھانسی میں مشاعرہ منعقد کردیا اور ہمارے نام وارنٹ مشاعرہ المتخلص بہ کارڈ مشاعرہ بھیج دیا اور لکھدیا کہ یہ مشاعرہ تمھارے لیے ہے اگر نہ آئے تو اچھا نہ ہوگا۔ ہم نے کارڈ اُٹھا کر ایسی

جگہ رکھدیا کہ اگر پھر خود بھی تلاش کرنا چاہتے تو نہ ملتا۔ لیکن جب ہر
دوسرے تیسرے دن ایک کارڈ آنا شروع ہوگیا تو ہم نے غور کیا کہ
کہیں قیامت کی طرح ہمارا جھانسی جانا بھی برحق تو نہیں ہے۔۔ اور
بعد میں یہی نتیجہ نکلا کہ قیامت برحق ہو یا نہ ہو لیکن جھانسی جانا ضرور برحق
ہے۔ لہٰذا ہم نے لکھدیا کہ آئیں گے، حالانکہ دفتر سے نہ تو رخصت مل
سکتی تھی نہ ہم رخصت لینا چاہتے تھے لیکن بعد میں رخصت ملی بھی اور
ہم نے رخصت لی بھی اور جھانسی روانہ ہونے کے لیے گھر سے چل کھڑے ہوئے۔
ہمارے ہم سفر ہم کو ملا کر چار تھے، یعنی ایک ہم خود ایک ہمارے دوست
اور حامد بھائی کے شاگرد رشید عبدالمجید صاحب کمال ایک لکھنؤ کے
مشہور رسالہ "خضر راہ" کے ایڈیٹر جناب حامد ندوی۔ اور ایک ان
حامد ندوی صاحب کے بھائی یعنی خالہ زاد برادر عزیز جن کا اسم مبارک
ہم کو راستہ بھر بتایا گیا مگر ہم یاد نہ رکھ سکے۔ ہم چاروں ایک جگہ جمع ہو کر
جتھے کی شکل میں چلے اور چونکہ چار تھے لہٰذا ریلوے اسٹیشن بھی چار باغ
قسمت سے ملا جہاں سے جھانسی اکسپرس ہر روز رات کو سوا گیارہ بجے
چھوٹا کرتی ہے اور چونکہ وہ یہیں سے چھوٹتی ہے لہٰذا مسافر جب

چاہتے ہیں اپنا بوریا بندھنا لیکر اس میں اطمینان سے آبیٹھتے ہیں یہاں تک کہ عین وقت پر ہماری طرح پہونچنے والے مسافر ہر درجہ کے پاخانہ تک میں بھر سے ہوئے آدمیوں کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں۔ اور انجن سے لیکر گارڈ کے ڈبہ تک اور گارڈ کے ڈبہ سے لیکر انجن تک دوڑنا شروع کرتے ہیں۔ اگر کسی ڈبے میں داخل ہونے کا ارادہ کرتے ہیں تو فوراً اس ڈبے کے مسافر " گو بیک " کا نعرہ لگاتے ہیں، بلکہ دھکا دیکر دروازہ بھی بند کر دیتے ہیں۔ اسی کوشش میں گاڑی کی روانگی کا وقت آجاتا ہے اور مسافر جس درجہ میں چاہتے ہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ یہی حال بالکل ہمارا ہوا کہ جب ہم مع اپنے رفقاء سفر کے پلیٹ فارم پر پہونچے تو ہر ڈبہ میں جلیانوالہ باغ کا منظر تھا، ہم نے اور ہمارے ½ درجن رفقاء سفر نے ہر طرح جگہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن جب گارڈ نے بھی اپنے ڈبے میں جگہ دینے سے انکار کر دیا، تو مجبوراً ہم سب نے ٹکٹ بدلوانے کی ٹھہرالی، اور یہ سمجھ کر کہ ٹکٹ کلکٹر خود ٹکٹ بدل دیگا۔ ایک شریفوں والے ڈربے میں نہایت اعزاز کے ساتھ بیٹھ گئے۔ گاڑی چلی، ہوا آئی، پسینہ خشک ہوا تو ذرا حواس درست

ہوئے اور آنکھیں کھل گئیں، دیکھتے کیا ہیں کہ ایک صاحب تمام مسافروں کے ٹکٹ ملاحظہ فرما رہے ہیں اور ہماری طرف دیکھ دیکھ کر ہنستے بھی جاتے ہیں، ہم پہلے تو اس ہنسی کے معنی نہ سمجھے لیکن جب ان کا تبسم مسلسل ہو گیا تو ہم نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کے دیکھا کہ کون سی ہنسنے والی چیز لگی ہے مگر وہاں حسب معمول ناک، کان، آنکھیں، چشمہ، مونچھیں وغیرہ تھیں، ہم سمجھے کہ شاید ناک وغیرہ پر سیاہی لگی ہو گی لہٰذا ہینڈ بیگ سے آئینہ نکال کر منہ دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا ہم بالکل ویسے ہی تھے جیسے ہمیشہ ہوتے ہیں مگر نہ اب تک ہنس رہے تھے، اور اب تو ہم کو انکی ہنسی پر غصہ بھی آرہا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ ہم ان پر غصہ اتاریں وہ ہماری طرف بڑھے اور ہنسکر فرمایا:-

"السلام علیکم شوکت صاحب۔"

ہم نے بھی بظاہر خوش اخلاق بن کر جواب دیا "علیکم السلام"، مگر ہم کو حیرت تھی کہ یہ حضرت ہیں کون؟ لاکھ لاکھ کوشش کی کہ ان کو پہچان لیں مگر نہ پہچان سکے، ہم محو حیرت ہی تھے کہ اُنھوں نے پھر فرمایا "کہیے مزاج شریف"، ہم نے جواب دیا "الحمد للہ"، "مگر آپ کا اسم گرامی" کہنے لگے

"اجی بس کرو مین سمجھیے۔ آپ مجھ سے ناواقف ہیں مگر میں نے آپ کو الہ آباد کے مشاعرے میں اور رسالہ "ادیب" کے عید نمبر میں دیکھا ہے۔ آپ ایسی چیز نہیں ہیں کہ آپ کو کوئی نہ جانے، یہ تو ہم ہی لوگ ہیں کہ خود بھی اپنے کو نہیں جانتے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ کے پاس کچھ دیر بیٹھنے کا موقع ملا، آپ کہاں تشریف لیے جا رہے ہیں۔"

میں۔ "کانپور کے آگے جھانسی جاؤنگا جہاں چاچا بھائی رہتے ہیں۔"

کرو مین۔ "بہت مناسب تو کانپور تک میرا بھی ساتھ ہے۔ جھانسی تو آپ صبح پہونچیں گے۔

میں۔ حضرت خوش قسمتی تو یہ ہماری ہے اس لیے کہ ہم کو اپنے ٹکٹ بدلوانا تھے، اب آپ بدل دیجیے۔"

کرو مین۔ "اجی چھوڑیے اس قصہ کو اس قیمتی وقت کو یوں ضائع نہ فرمائیے، ٹکٹ بدلے ہوئے سمجھیے۔"

میں۔ "ہمارے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے آپ اور آپ کے محکمہ والے جب سمجھیں تو ایک بات بھی ہے۔"

کرو میں۔ "شوکت تھانوی کے لیے سب کو یہی سمجھنا پڑیگا۔ آپ اطمینان

رکھیے ہم ذمہ دار ہیں ۔"

میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور اب ذرا جان میں جان آئی بلکہ خوشی ہوئی کہ دام بھی بچے، دیکھیے اگر آج ہم اتفاق سے شوکت تھانوی نہ ہوتے تو دام بھی دینا پڑتے، اور جرمانہ بھی اسکے علاوہ خواہ مخواہ جھگڑا ہوتا اب یہ ہوا کہ اُن حضرت سے پُرلطف باتیں کرتے ہوئے مزے سے چلے گئے۔ اُنھوں نے ایک مرتبہ کچھ سُنانے کی فرمائش کی، جسکو ہم نے ٹال دیا۔ مگر جب اُنھوں نے دوسری مرتبہ اصرار کیا تو ہم کو اُن کا احسان یاد آگیا اور ہم نے اُن کو کچھ سُنا دیا جسکو اُن کے علاوہ ہمارے درجہ کے تمام اُردو داں، ہندی داں، انگریزی داں بلکہ اُن لوگوں نے بھی جو کچھ "داں" نہ تھے نہایت غور سے سنا، اور کانپور پہونچتے پہونچتے ہم اپنے درجہ کے ڈاکٹر اقبال اور رابندرناتھ ٹیگور بن چکے تھے، کانپور کے اسٹیشن پر ہمارے محسن کروپن صاحب وغیرہ لوگ اُتر گئے اور نئے لوگ آ گئے۔ لیکن چونکہ بارہ سے زیادہ بج چکے تھے، لہٰذا ہم نے اپنے ساتھیوں کے سامنے سونے کی تجویز پیش کی جو باتفاق منظور ہو گئی، لہٰذا سب دراز ہو گئے۔ اور دراز ہونے کے

لیے کسی سے جنگ کرنا نہیں پڑی اس لیے کہ حامد ندوی بیچارے ندوے کے سیدھے سادے مسلمان ہیں لہذا وہ بیٹھے رہے اور کمال نے پیر لٹکا کر آرام کرسی کی طرح لیٹنا مناسب سمجھا۔ حامد ندوی کے برادر عزیز بچوں کی طرح سمٹ کر لیٹ گئے، اور ہم سرتا بپا بڑے آدمیوں کی طرح دراز ہو گئے، یہ کہنا تو غلط ہو گا کہ نیند آئی لیکن یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ جاگتے رہے۔ مختصر یہ کہ وہ کبھی جاگے کبھی سو لئے، کبھی سوئے کبھی جاگے، اور اسی عالم میں جھانسی پہونچ گئے۔

جھانسی کے اسٹیشن پر دور ہی سے حامد بھائی نظر آئے۔ لہذا گاڑی کے ٹھہرتے ہی ہم سب سے پہلے ان کی طرف جھپٹے اور وہ ہماری طرف بیتابی سے بڑھے مگر متانت کے ساتھ، اس لیے کہ اُن کے ایک آدھ شاگرد بھی ساتھ تھے، ہم دونوں کا ایک مقام پر تصادم ہو گیا، جسکو معانقہ کہتے ہیں، اس سے فارغ ہو کر ہم تو مسافروں کے اُترنے کا تماشہ دیکھنے لگے اور حامد بھائی ہمارے ساتھیوں سے ملتے رہے، حامد بھائی کے ساتھ ان کے ایک شاگرد صابر صاحب بھی تھے، جو بعد میں معلوم ہوا کہ جھانسی کے بڑے تاجروں میں سے ہیں اور شاعر بھی ہیں،

اہم صابر صاحب سے بھی ملے، مگر ہم نے اُن کی کم سخنی کا اُسی وقت اندازہ کرلیا، جب وہ ہر بات کا جواب تبسم سے دیتے رہے، مگر اُن کے خلوص کا سکہ بھی اُسی وقت دل پر بیٹھ گیا، ہم سب اسٹیشن سے باہر آئے اور حامد بھائی کے ساتھ ساتھ ایک ایسی جگہ پہونچے جہاں سنگ مرمر کی میزوں پر جنٹلمین چاء وغیرہ پیتے ہیں۔ حامد بھائی نے چاء کا انتظام یہیں کیا تھا۔ لہٰذا اس میں بھی آدھ گھنٹہ سے زیادہ ہی وقت لگا چاء کے بعد ہم لوگ ایک گاڑی پر بٹھا دیے گئے، اور ہمارا خیر مقدم کرنے والے بائیسکلوں پر سوار ہو گئے۔ گاڑی کے چلنے سے پہلے ہم نے گھڑی نہیں دیکھی تھی، اِس لیے صحیح طور پر نہیں بتا سکتے کہ کب ہم لوگ حامد بھائی کے مکان پر پہونچے لیکن اندازاً بتا سکتے ہیں کہ یہ سفر بھی معمولی نہ تھا، اسٹیشن سے حامد بھائی کا مکان کافی دُور ہے لیکن اس میں اُن کے مکان کا قصور نہیں ہے وہ بیچارہ تو آبادی شروع ہوتے ہی سب سے پہلے ہم کو مل گیا، لیکن خود آبادی اتنے فاصلہ پر ہے کہ ایک دوسرا اسٹیشن بننا چاہیے تھا۔ اسٹیشن سے مکان تک سڑک کے ہر دو جانب ایسے ایسے نشیب و فراز تھے کہ نشیب ہی تو

خندق سے کم نہیں اور فراز ہے تو پہاڑ کے برابر۔ بس یہ سمجھیے کہ ان ہی نشیب و فراز سے جھانسی بھرا پڑا ہے۔ بلکہ شاید جھانسی کے لغوی معنی نشیب و فراز کے ہیں۔ ہم نے تو تمام راستہ بس پتھر کے چھوٹے بڑے ٹکڑے، پہاڑ، ٹیلے، اور پہاڑ دیکھے۔ خود حامد بھائی کے مکان پر پہونچ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب تجلیاں چمک کر ہم کو بیہوش کر دینگی، اور اس ٹیلہ کو جس پر حامد کدہ واقع ہے جلا کر راکھ کر دینگی۔ اس وقت ہمارا دل چاہتا تھا کہ طور کے متعلق شاعروں نے جتنے شعر اب تک کہے ہیں سب پڑھ ڈالیں، لیکن مکان میں داخل ہو کر اس کرسی پر بیٹھیے، اس تپائی پر پیر رکھیے۔ اس کھونٹی پر شیروانی ٹانگیے کے تکلفات نے ہمارے خیالات کو منتشر کر دیا جس کمرے میں ہم بیٹھے تھے وہ صبح آٹھ ہی بجے سے اتنا گرم تھا جتنے لکھنؤ کے کمرے بارہ بجے گرم ہوتے ہیں۔ اور نو بجے سے ایسی لو چلنا شروع ہوئی جیسی لکھنؤ کہیں مئی اور جون کے وسط میں بھی نہیں چلتی۔ اس "لو" کے متعلق ہمکو حامد بھائی اور اُن کے دوستوں، شاگردوں اور بھائیوں نے ڈرانا شروع کیا کہ یہ لو بڑی خطرناک ہوتی ہے اسکا مارا ہوا سانس بھی نہیں لیتا،

اور جس کو یہ آگ لگ جاتی ہے پھر زندہ نہیں چھوڑتی وغیرہ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ ہم کو اتنا خوف زدہ کر دیا کہ ہم کلمہ پڑھنے لگے اور ہوا کی سرسراہٹ پر ہم کو اپنے متعلق یہی شبہ ہونے لگا کہ ہم پردیس میں آکر مرحوم ہو گئے دیکھیے مٹی کہاں کھینچ کر لائی تھی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم اور ہمارے ساتھی سب بخیریت رہے، اتنا ضرور ہوا کہ دن بھر کی شدید گرمی سے ہم سب تقریباً نصف ضرور گھل گئے ہونگے، خدا کی پناہ گرمی ہوتی ہے کہ جہنم ہوتا ہے۔ اگر واقعی جہنّم جھانسی سے بھی زیادہ گرم مقام ہے تو یقیناً ناقابل برداشت ہے وہ لوگ جو جہنم کو تماشا سمجھے ہوئے ہیں ایک مرتبہ جھانسی ہو آئیں شاید اُن کو بھی ہماری طرح گناہوں سے توبہ کرنا پڑے گی معلوم نہیں یہ جھانسی کے بسنے والے خدا کے بندے کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں ہم ہوتے تو اب تک منجملہ اور پتھروں کے یا تو پتھر ہو جاتے یا جہنم کے داروغہ کی جگہ کے لیے اس حوالہ سے عرضی بھیجتے کہ "ہم جھانسی میں رہ چکے ہیں" یعنی ملاحظہ فرمائیے کہ تھوڑی ہی دیر میں جب ہم کو یہ یقین ہو گیا کہ اب ہم گرمی کی شدت سے بجائے شوکت تھانوی کے ایک شعلہ جوالہ بن جائیں گے تو ہم نے نہایت

سرد پانی سے غسل کیا۔ طبیعت ذرا بشاش ہوئی۔ لیکن پھر وہی کیفیت شروع ہو گئی اور شام تک یہی عالم رہا۔ غضب خدا کا! ان جھانسی میں رات کو بارہ ایک بجے بھی "لُو" چلتی ہے۔ دوپہر کا تو کہنا ہی کیا۔ ہم نے چاہا تھا کہ رات کے جاگے ہوئے ہیں لاؤ ذرا دن میں سو لیں لیکن چارپائی پر یہی حال تھا کہ۔

؟

"جو جل اُٹھتا تھا یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے تھے"

کچھ تو اس جہنمی گرمی نے لطف سفر کو بھون دیا، اور کچھ انیس حامد کی علالت سے بے لطفی پیدا ہو گئی تھی، بیچاری آج کل اختناق الرحم کے سخت دوروں میں مبتلا ہیں خدا رحم کرے اور صحت کلی عطا فرمائے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جھانسی کی گرمی اُنکے لیے سخت مُضر ہے۔ ہم کو تو تعجب ہے کہ وہاں کے مردوں کو اختناق الرحم کے دورے کیوں نہیں پڑتے، وہاں تو جو کچھ بھی نہ ہو جائے کم ہے۔ معلوم نہیں کہ جب حامد بھائی کو جھانسی میں سکونت اختیار کرنا تھی تو انھوں نے شادی کی زحمت کیوں فرمائی یہ بھی کوئی بات ہے کہ پرائی لڑکی کو گھر در سب چھڑا کر جھانسی میں رکھ چھوڑا ہے اور پھر لطف یہ ہے

کہ اُن کی علالت سے آپ پریشان بھی ہوتے ہیں، مگر صاحب یہ ہندوستان کی عورتیں چاہے حامد بھائی کی بیوی ہوں یا مہاتما گاندھی کی بیوی، اپنے شوہر کی ایسی فرمانبردار ہوتی ہیں کہ سبحان اللہ، یہ جھانسی کی گرمی ملاحظہ فرمائیے اور پھر وہاں کے باورچی خانوں کی کیفیت کا تصور کیجیے۔ اسکے بعد اختناق الرحم کے دوروں کو پیش نظر رکھیے اور انیس حامد کا ہم لوگوں کے لیے کھانا تیار کرنا دیکھیے۔ واللہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر مرد عورتوں کی بیویاں ہوا کرتے تو چاہے طلاق ہی تک کیوں نہ نوبت پہونچتی لیکن وہ کام نہ ہو سکتا جو انیس حامد نے کیا اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ فوراً دورا پڑا۔ ہم اپنے دل میں اپنے کو لعنت ملامت کر رہے تھے کہ یہ سب کچھ ہماری ہی وجہ سے ہوا ہے مگر ہم کو اس کی واقعی اطلاع نہ تھی ورنہ ہرگز نہ جاتے، وہ تو کہیے کہ حامد بھائی کے ایک قریبی عزیز عشرت صاحب جو علیگڈھ کے گریجویٹ ہیں اور مسلم یونیورسٹی میں رہنے کی وجہ سے کھانا نہایت عمدہ پکانے لگے ہیں، اس لیے کہ وہاں تو ہر طالب علم بغیر اپنے ہاتھ سے کھانا پکائے زندگی ہی بسر نہیں کر سکتا، اگر وہاں کے کھانے پر پڑا رہے تو تھوڑے ہی دنوں میں یا تو ولی اللہ

ہو جائے ورنہ کم از کم بہاتما گاندھی ضرور بن جائے۔ اگر آلو کی فصل ہے
تو چھ مہینہ تک دونوں وقت آلو ہی آلو ملیں گے، ہاں تو وہ عشرت
صاحب کا علیگ ہونا ذرا کام آگیا، اُنھوں نے رات کا کھانا اپنی
"علیگی" قابلیت سے ایسا پکایا کہ لطف آگیا اور اس وقت ہم نے
شکم سیر ہو کر کھانا کھایا اوّل تو احساس پر یہ تکلیف تھی کہ انیس حامد نے
جس طرح بھی ہو سکا ہے اسکو تیار کیا ہے۔ دوسرے ایمان کی بات
یہ ہے کہ کھانا بھی ذرا فرے کا تھا، کھانا کھا کر مشاعرہ کی باری تھی
اس لیے پانی بھی زیادہ نہیں پیا کہ کہیں بیتابی معلوم ہو۔
جھانسی ایسے کنکریلے پتھریلے مقام میں ذوق شعری پیدا کرنا جوئے شیر
لانے سے کم نہیں ہے۔ لیکن یہ آپ کے صادق صاحب دہلوی اور حامد صاحب
شاہجہانپوری کوئی ایسے ویسے تو ہیں نہیں کہ کوہکن کی طرح تیشہ مار کر رہ جاتے
اُنھوں نے یہاں کے پتھروں میں بھی شعریت کی روح پھونک دی ہے اور
واللہ ایسا صحیح مذاق پیدا کر دیا ہے کہ ہم تو مشاعرے میں ہاں کے شاعروں کو
دیکھتے تھے، جھانسی کے قلعے کو دیکھتے تھے اور خدا کی قدرت کا دل ہی دل
میں اعتراف کرتے تھے، یعنی پتھروں کو ہیرا بنا دیا حضرات دہلی اور لکھنؤ کے

بس میں نہیں ہے وہ تو بس خود جو کچھ ہو گئے ہیں اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں اور اپنی عزت و آبرو لیے چپکے بیٹھے ہیں، لیکن جھانسی ایسے مقام پر جاکر اُردو شاعری کے اس ارتقائے ہم کو بہت متاثر کیا اگر کہیں یہ صادق صاحب دہلوی اور حامد صاحب شاہجہانپوری کچھ دن اور جھانسی میں رہ گئے تو ہم کو ڈر ہے کہ کہیں جھانسی بھی اُردو زبان کی مرکزیت کا دعویدار نہ بن جائے۔ مشاعرے میں نہایت عمدہ عمدہ غزلیں سُننے میں آئیں اور خدا کا شکر ہے کہ مشاعرہ بھر میں "بلبل" کا نام نہیں آیا۔ سامعین کی تعداد بھی کافی تھی اور سب نہایت شوق کے ساتھ ہمہ تن گوش بن کر بیٹھے ہوئے تھے۔ مشاعرہ شروع سے آخر تک نہایت کامیاب رہا لیکن آخر میں ایک "میڈان مبیئی" شاعر اپنے غیر طرح کلام سے ایسا لطف اندوز کیا کہ مشاعرہ کا تمام لطف لوٹ لے گئے۔ اب تک اُن کی آواز دماغ میں گونج رہی ہے اگر وہ ایک دو تین کے بعد چوتھی غزل بھی بغیر کسی فرمائش کے پڑھتے تو شاید ہم کانوں میں اُنگلی لگا کر جھانسی سے بھاگتے تو لکھنؤ میں آکر دم لیتے معلوم نہیں ان حضرت کا کلام کیسا تھا لیکن جس انداز سے وہ گردان کو

ہلا کر نغمہ ریزی فرماتے تھے، اُسکو سُننے کے لیے خاص طور پر ہم نے کان نہیں بنوائے تھے، یہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ یہ "غیر طرحی شاعر" جب بیاض کھول کر بیٹھ جاتے ہیں تو جب تک مشاعرے کے ایک ایک آدمی کو بھگا نہیں لیتے اُس وقت تک دم نہیں لیتے یہی حال اُن بزرگوار کا بھی تھا، ان کا تو شاید یہ دل چاہتا تھا کہ اب تک جتنے شعر کہے ہیں سب سُنا دیں، لیکن جب سُننے والے ایک چوتھائی سے بھی کم رہ گئے تو وہ بھی "و باقی دارد" کے انداز سے اپنی جگہ پر واپس آ گئے۔ اور ہم نے ٹوپی اُتار کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے زندگی بھر میں پہلی مرتبہ سچے دل سے الحمد للہ کہا مگر اتنا اثر ضرور ہم پر ہوا کہ ہم نے مشاعرے کے اچھے اچھے شعر جب یاد کرنے کی کوشش کی تو ایک بھی یاد نہ آیا۔

مشاعرے کے بعد سوائے گھوڑے بیچ کر سونے کے اور کیا کر سکتے تھے حالانکہ تین بجے رات کو سو کر صبح آٹھ بجے اُٹھنا ہماری سمجھ میں اب تک نہیں آیا ہے کہ کون سی انسانیت ہے لیکن یہاں انسانیت کا تو سوال ہی نہیں ہے اس لیے کہ یہ مشاعرہ منعقد کرنے والے شاعر کو انسان ہی نہیں سمجھتے یا یہ نہیں جانتے کہ بیچارہ شاعر انسان بنا رہے

ورنہ یہ رات کو مشاعرہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے جہاں تک جھانسی کا تعلق ہے وہاں تو رات ہی کو مشاعرہ ہو سکتا ہے، اور مشاعرے ہی پر کیا موقوف ہے، وہاں زندگی کے تمام مشاغل ہیں رات کے لیے اُٹھا رکھے جاتے ہیں اور دن زندگی سے خارج سمجھا جاتا ہے، ہم نے تو وہاں کے باشندوں کا جیتے جی اس عذاب جہنم میں مبتلا ہونا دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھا، اور اس جہنم ارضی کو دیکھ کر دوزخ کی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچ گئی۔ ہاں تو وہاں اگر مشاعرے رات کو ہوتے ہیں تو خیر ایک بات بھی ہے، لیکن دوسرے شہروں میں رات کے مشاعروں کا دستور بیچارے شاعروں کی جماعت کو اشرف المخلوقات کے اعزاز سے محروم کر دینے کی ترکیب ہے یا نہیں؟ لیکن یہ صاحبان مشاعرہ کان کھول کر سُن لیں کہ شاعروں کا طبقہ ایسا نہیں ہے کہ اُسکو ان ترکیبوں سے غیر شاعر بنایا جا سکے، یہ تو رات کے مشاعرے ہیں، اگر یہ دستور ہو جائے کہ ٹھیک بارہ بجے جھانسی کے تپتے ہوئے مقام پر مشاعرہ منعقد کر دیا جائے تو بھی شاعر کافی تعداد میں شریک ہونگے۔ ہم لوگ شاعر ہیں کوئی دل لگی نہیں ہے۔

مشاعرہ ختم کر کے جو ہم سوئے تو اُس وقت بیدار ہوئے جب سورج کی کرنوں نے تمام بدن میں سوئیاں پیوست کرنا شروع کر دیں اور حامد بھائی کے شاگرد ملال جو اپنے تخلص کے برعکس ایک متبسم فطرت کے نوجوان ہیں اور جن کو میں ہمیشہ شریر ملال کہا کیا، مجھ کو بیدار کرنے کے لیے آ گئے جی تو چاہتا تھا کہ چھتری لگا کر پھر سو رہیں، لیکن ملال کا کیا علاج تھا جو اس مستقل مزاجی سے "شوکت صاحب، شوکت صاحب" کی رٹ لگائے ہوئے تھے، کہ اگر شوکت صاحب مر گئے ہوتے تو روح کو جواب دینا پڑتا، مجبوراً بیدار ہوئے اور ابھی ضروریات سے فارغ بھی نہ ہونے پائے تھے کہ حامد بھائی نے آ کر فرمایا کہ صادق صاحب کے یہاں آپ اس وقت مدعو ہیں اور اُن کی خواہش ہے کہ آپ آٹھ ہی بجے پہونچ جائیں۔ ہم کو یہ تو اطمینان تھا کہ آٹھ بج ہی چکے ہیں، لیکن صادق صاحب کے خلوص کا تقاضا تھا کہ ہم نے تیار ہونے میں غیر معمولی جلدی کی یہاں تک کہ داڑھی بھی "تشنہ شد" رہی اور ہم چائے سے فارغ ہو کر صادق صاحب کے یہاں پہونچ گئے۔ صادق صاحب بیچارے شاعر ہونے سے زیادہ انسان ہیں۔ ہم تو اُن کے خلوص کی اس

حد تک قدر کرتے ہیں کہ اگر وہ شاعر بھی نہ ہوتے تو ہم کو ایسے ہی اچھے
لگتے جیسے شاعر ہوتے اور ہماری دعوت کرنے بعد اچھے لگے، اس زمانہ
میں شاعروں کی کمی نہیں ہے لیکن انسان نایاب ہیں اور جو لوگ انسان
ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہیں اُن کے متعلق ہماری رائے ہے
کہ وہ تو غلطی سے دُنیا میں بھیج دیے گئے ہیں ورنہ اُن کی اصلی جگہ تو
جنت میں ہے، اسی قسم کے فرشتہ صورت انسانوں میں جناب صادق
دہلوی کا بھی شمار ہے۔ بہت ممکن ہے کہ زیادہ میل جول اور بے تکلفی
کے بعد صادق صاحب اتنے اچھے آدمی ثابت نہ ہوتے جس قدر
اس مختصر وقت میں ثابت ہوئے لیکن مختصر وقت میں بھی اچھے آدمی
ثابت ہونے والے آج کل کمیاب ہیں۔ صادق صاحب کے یہاں
دعوت کے سلسلہ میں ایک مختصر سی بزم سخن بھی تھی، جس میں سب نے
ایک دوسرے کو اپنا کلام سُنایا اور داد کا لین دین بالکل اسی طرح ہوا
جس طرح اخبارات میں تبادلہ ہوتا ہے۔ دور مشاعرہ کے بعد دور طعام تھا
اور چونکہ شعر سُنانا بلکہ سُننا بھی ایک قسم کی ورزش ہے لہذا اسکے بعد
بھوک کا شدت کے ساتھ معلوم ہونا بھی ضروری ہے، ہماری سمجھ میں

نہیں آتا کہ مشاعروں میں دعوت کا دستور کیوں نہیں ہے اگر مشاعروں میں دعوت بھی ہوا کرے تو یہ کمی بھی پوری ہو جائے اور مشاعرے بھی موجودہ صورت سے زیادہ کامیاب ہوں اس لیے کہ شعرا کی کثیر تعداد شریک ہوا کرے۔ بہرحال صادق صاحب کے یہاں کی بزم سخن اس لیے پُر لطف تھی کہ اسکے بعد دعوت کا اہتمام تھا اور دعوت اس لیے پرکیف تھی کہ کھانا لذیذ تھا اور بھوک شدید، شکم سیر ہو کر اس طرح کھایا گویا سات فاقوں کے بعد غذا ملی ہے، کھانا کھانے سے پہلے ہی ماسٹر افضل صاحب کا خط آچکا تھا کہ یہ قافلہ صادق صاحب کے یہاں سے واپسی پر پہلی منزل ان کے درِ دولت کو بنائے۔ لہذا ہم لوگ صادق صاحب سے رخصت ہو کر چلچلاتی ہوئی دھوپ میں کانوں کو رومال سے باندھے ہوئے اس طرح چلے گویا پا پیادہ حج کے ارادے سے چلے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہم کو ایک آتشِ سیال کے سمندر میں غرق کر دیا گیا ہے اور ہم لوگ اس سمندر کی تہ میں یہ سفر کر رہے ہیں، سڑکوں اور گلیوں سے گزر کر ماسٹر افضل صاحب کے مکان پر پہونچے؛ جہاں پہونچتے ہی ایک ایک کرسی پر اس طرح دراز ہو گئے کہ تہذیب اور اخلاق کا ہوش بھی نہ تھا۔ جب خس کی ٹٹی سے

جس کو لوگ گھبراہٹ میں "ٹٹ کی حسی" کہہ دیا کرتے ہیں۔ خنک ہوا آئی تو ہم سب کو احساس ہو کہ ہمارے پیر کدھر ہیں اور سر کدھر، ماسٹر افضل صاحب نے تربوز کا نہایت لطیف شربت منگایا جس کے سُرخ پانی میں تربوز کے چھوٹے چھوٹے ٹکرے اس طرح پڑے تھے کہ ہماری سمجھ میں پہلی مرتبہ اس شعر کا مطلب آیا۔ ؎

خون دل کھانے کو اور لخت جگر پینے کو
یہ غذا ملتی ہے جاناں ترے دیوانے کو

ورنہ آج تک ہم اس شعر کا مطلب یہ سمجھتے تھے کہ "اے جاناں ترے دیوانے کو یہ غذا ملتی ہے کہ وہ خون دل پانی کی جگہ پی لیتا ہے اور اولاد کو کھانے کی جگہ کھا جاتا ہے۔" اس لیے کہ "لخت جگر" ہمارے یہاں اولاد کو کہتے ہیں۔ مگر تربوز کے شربت کو دیکھ کر بلکہ پی کر ہم سمجھے کہ خون دل اس طرح پیا جاتا ہے جس طرح ہم نے شربت پیا، اور "لخت جگر" اس طرح کھائے جاتے ہیں جس طرح ہم نے "لخت تربوز" کھائے۔ اس تربوز کے شربت نے آبحیات کا کام کیا، جان میں جان آگئی، خدا ماسٹر افضل صاحب کا کلیجہ بھی

ایسا ہی ٹھنڈا رکھے جیسا اُنھوں نے ہم کو مرنے سے بچا لیا، اُس اکل و شرب .... کے بعد ہم سے کہا گیا کہ "ہاں چیخو گلا پھاڑ کر" یعنی شعر سنائیے۔ لہذا ہم نے سُنانا شروع کیا، اور اس وقت تک سُناتے رہے جبتک ہماری آواز اس گراموفون کی سی نہیں ہو گئی جس کی ایک دم سے کوک ختم ہو جائے، اس نوبت پر پہونچنے کے بعد ہم کو معاف کر دیا گیا اور ہمارے میزبان نے اپنے دوست مولوی عبدالباری صاحب وکیل جھانسی سے جو خاص طور پر ہماری بکواس سُننے کے لیے بُلائے گئے تھے، کہا کہ اب سیر ہونا چاہیے۔ اُنھوں نے بھی تائید کی، لہذا ہم اور حامد بھائی ماسٹر افضل صاحب اور عبدالباری صاحب ایک گاڑی پر جو عبدالباری صاحب کی تھی بیٹھکر چلے سیر کرنے کو اور سارا جھانسی چھان مارا۔ اس سیر کے بعد ایک بات ہم کو عجیب و غریب نظر آئی کہ یہ جھانسی کا قلعہ ہر حصۂ شہر سے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہیں پر ہے۔ یعنی جتنا فاصلہ حامد بھائی کے مکان سے نظر آتا تھا اسی قدر دو تین میل کے فاصلہ سے نظر آیا۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ یہ قلعہ ساتھ ساتھ چلتا ہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ وسط شہر میں واقع ہے۔ لہذا ہر طرف سے اور ہر جگہ سے

یکساں نظر آتا ہے خواہ مخواہ ہم کو یاروں نے اتنا چکر دیا، بس قلعہ کے
کسی مینار پر ہم کو لے جاتے وہاں سے ہم تمام شہر دیکھ لیتے۔ اور دیکھنا
ہی کیا تھا، بس پتھر یا زیادہ سے زیادہ تمام شہر میں صرف ایک مقام پہ
چند کھجوروں کے درمیان مختصر سا سبزہ دار جسکو جھانسی والے سبزہ زار
کہتے ہونگے، ہم تو خار زار کہنے کو بھی تیار نہیں ہیں۔ مختصر یہ کہ تمام شہر گھوما
مگر وہ دیکھا جو بغیر گھومے ہوئے دیکھ چکے تھے، یعنی پتھر۔ اس سیر کے بعد
مسٹر عبدالحکیم وکیل کے یہاں دعوت تھی۔ عبدالحکیم صاحب شب گزشتہ
مشاعرہ کے صدر بھی تھے، اور غالباً یہ دعوت حق صدارت ادا کرنے کی
علت میں تھی۔ بہرحال ہم کو تو کھانے سے مطلب، پہونچے وہاں بھی اور
تھرڈ کے چوہوں کی طرح شکم سیر ہو کر کھانا کھایا، خدا کا شکر ہے کہ عبدالحکیم
صاحب کے یہاں کچھ سننا یا سنانا نہیں پڑا۔ جان بچی لاکھوں پائے،
دعوت کے بعد سیدھے گھر آئے۔ اس لیے کہ اسباب درست کر کے
واپس بھی تو ہونا تھا، گھر پہونچے اور اسباب درست کیا بیچارے چا بھائی
میزبانی اور اپنی بیوی کی تیمارداری کے دوہرے فرائض انجام دیتے دیتے
درد سر میں مبتلا ہو گئے۔ وہ تو کہیے کہ ہم دو دن اور ایک رات ہی رہے

اگر زیادہ رہتے تو نہیں معلوم کس کس کو کن کن امراض میں مبتلا کر کے چھوڑتے، ہم اپنے متعلق نہیں کہتے ہیں، ہماری رائے تو عام شعراء کے لیے ہے کہ وہ طاعون وغیرہ کے قسم کے وبائی امراض سے کم تھوڑی ہوتے ہیں، ہاں تو حامد بھائی سے ہم نے کہا، استدعا کی، التجا کی، بھیک مانگی کہ خدا کے لیے اب رحم کیجیے اور جا کر لیٹ رہیے، مگر وہ بندۂ خدا ایک نہ مانا، اور اسٹیشن جانے کے لیے تیار ہو گیا، ہم نے ستیہ گرہ کر دی کہ جاؤ ہم بھی نہیں جاتے۔ مجبوراً وہ حضرت اسٹیشن نہ جانے پر راضی ہو گئے۔ تانگہ کی جستجو میں حامد بھائی کے شاگرد ہلال صاحب نے جو کمال دکھائے ہیں وہ یقیناً ایسے تھے کہ اگر ہلال صاحب سی، آئی، ڈی، کے سب انسپکٹر ہوتے تو خان بہادری کے خطاب کے بعد انسپکٹر بنا دیے جاتے۔ صاحب یہ ہلال صاحب بھی نہایت لاجواب آدمی ہیں۔ بڑی محبت کے، بڑے خلوص کے، بڑی سمجھ کے، بڑی عقل کے اور اس قدر پاکیزہ ذوق رکھنے والے شاعر ہیں کہ کسی زمانہ میں "دیوان ہلال" کا بھی مرقع چغتائی تیار ہو گا۔ اُس کا ایک شعر ہم نے سُنا اور اُس میں ترمیم پیش کی، شعر یہ تھا:۔

اُن کی تصویر سامنے رکھکر　　　اپنا انجام سوچتا ہوں میں
ہم نے ترمیم پیش کی کہ :۔
اپنی تصویر سامنے رکھکر　　　اپنا انجام سوچتا ہوں میں
اور دوسری رائے ہم نے اُن کو یہ دی تھی کہ تخلص بجائے "ہلال" کے یا تو چاند رکھ لیجیے یا چندا۔ مگر اُنھوں نے اس کو مذاق سمجھا خیر یہ تو مذاق ہے یا جو کچھ بھی ہے مگر تانگے لے آنا واقعی کمال تھا، جس کا اجر اُنکو خدا دیگا، رخصت کے وقت حامد بھائی کی بیار بیوی یعنی انیس حامد نے ہم کو ایک زریں بٹوا دیا جس پر دل چاہتا ہے کہ ایک مستقل مضمون لکھ ڈالیں۔ مگر فی الحال اُسکی الائچی اور تمباکو استعمال کر رہے ہیں۔ اسٹیشن جھانسی پہنچکر جب ریل میں پہونچے تو کچھ نہ پوچھیے۔ ؎
دیدم بہ درِ ریل "عجب شعبدہ کارے　　　میخانہ بدوشے و گلستاں بہ کنارے
اب اس کے بعد سب سمجھ سکتے ہیں کہ راستہ کیسے گزرا ہوگا۔ کاش یہ سفر ختم ہی نہ ہوتا۔
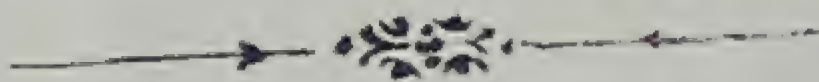
مشرقی اور مغربی کُتّا

مشرقی اور مغربی کُتّا

ہمارے بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ جس گھر میں کُتا ہوتا ہے اُس میں کبھی رحمت کے فرشتے نہیں آتے اور یہ بات ہمارے ذہن نشین اِس لیے ہوگئی تھی کہ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ جس گھر میں کُتا ہوتا ہے اس میں کوئی انسان بھی آزادی کے ساتھ نہیں جاسکتا، فرشتے تو پھر فرشتے ہوتے ہیں لیکن ہم اس بات کو کتے کی خصوصیات میں سے سمجھا کیے کہ وہ اپنے گھر میں گھر والوں کے علاوہ کسی کو نہ آنے دے خواہ وہ فرشتے ہوں یا چور، باوجود اسکے ہم کو ہمیشہ کتے سے پرہیز کرایا گیا کہ اگر کبھی ہم نے اپنے پڑوسی کے نہایت حسین و جمیل پلّے پر محبت سے ہاتھ بھی رکھ دیا تو ہمارا ہاتھ فوراً پاک کرایا جاتا تھا، اور ڈانٹ الگ سے پڑتی تھی۔ اِس وقت تو ہم اس احتیاط اور اجتناب کے معنی سوائے

بزرگوں کی ضد کے اور کچھ نہ سمجھ سکے تھے لیکن اب ہم کو معلوم ہوا ہے
کہ منجملہ اور جہالتوں کے ہندوستانیوں کی ایک افسوسناک جہالت
کتوں سے نفرت کرنا بھی ہے۔ تمام ہندوستانی تو خیر کتے کو جانور سمجھ کر
وہی درجہ دیتے ہیں جو جانور کو دینا چاہیے، لیکن مسلمانوں کا یہ حال ہے،
کہ کتے سے ایک قسم کی رقابت کا سلسلہ جاری ہے کہ اگر وہ بیچارہ
کپڑوں سے چھو جائے تو کپڑے نماز کے قابل نہیں رہتے، اگر پاؤں
چاٹ لے تو یہ پاؤں کاٹ ڈالیں گے ورنہ کم از کم دھو ضرور ڈالیں گے
مختصر یہ کہ یہ مسلماں کتوں سے دُور بھاگتے ہیں۔ حالانکہ مغربی اقوام
نے ثابت کر دیا ہے کہ انسان بغیر کتے کی معیت کے کبھی مکمل انسان
نہیں بن سکتا۔ اس وقت تمام مہذب اقوام کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے کو
مہذب ثابت کرنے کے لیے کتا ضرور ہمراہ رکھتی ہیں۔ کوئی جنٹلمین
بغیر کتے کے کبھی مکمل جنٹلمین نہیں ہو سکتا۔ کوئی لیڈی بغیر کتا بغل میں
دبائے کبھی لیڈی نہیں ہو سکتی۔ کوئی موٹر بغیر کتے کے موٹر نہیں ہوتا،
اور کوئی مکان بغیر کتے کے دولت خانہ نہیں سمجھا جاتا۔
ہندوستانیوں کی جہالت پر تو خیر رونا آتا ہے لیکن یورپ

اور امریکہ کی تہذیب ملاحظہ فرمائیے، کہ وہاں ہر معزز آدمی کی شناخت صرف یہ ہے کہ اُس کے سر پر، گود میں، آگے، پیچھے، ادھر، یا اُدھر ایک ہانپتا ہوا زبان نکالے دُم ہلاتا ہوا کُتا ضرور ہوگا اور اگر کسی مغربی آدمی کے ساتھ کتا نہ ہو تو اُس کے متعلق یہ بھی شبہ کیا جا سکتا ہے کہ آیا وہ آدمی بھی ہے یا نہیں اور اگر آدمی ہے تو کچھ یوں ہی سا ہے۔ مغربی خواتین کا یہ حال ہے کہ بغیر کُتّے کے اُن کو لطف زندگی ہی حاصل نہیں ہوتا جبتک اُن کی نرم اور معطر آغوش میں ایک پلہ نہ دبا ہو وہ اپنے عدم اور وجود کو یکساں سمجھتی ہیں اور اگر پلہ دبا ہوا ہے تو اُس سے ایسی محبت کرتی ہیں کہ انسان اس پر رشک کرے، اُسے اس طرح چومتی چاٹتی اور دبوچتی ہیں کہ اُن کے عشاق کُتا ان کر نہ پیدا ہونے پر فطرت سے شاکی ہو جاتے ہیں یا کُتا بنجانے کے لیے دست بدعا ہو جاتے ہیں۔ ورنہ یہ بات تو اکثر دیکھنے میں آئی ہے کہ محبوبہ کے کتے کو موقع پاکر محبت سے اُٹھا لینا ایک قسم کی "تقریب کچھ تو بہر ملاقات" ہوا کرتی ہے۔

سگِ لیلیٰ صرف ایک کُتا تھا، جو قیس کے لیے عظمت کے اعتبار سے خواہ ہاتھی کے برابر ہو یا اونٹ کے برابر، مگر دوسروں کے نزدیک

وہ ایک کتے سے زیادہ اور کچھ نہ تھا، لیکن مغربی ممالک میں سگ پرستی کا یہ حال ہے کہ انسان کی جگہ کتوں کو اشرف المخلوقات تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اور کتوں کو وہ درجہ حاصل ہے جو انسان کو بھی حاصل نہیں۔ مغربی ممالک کی وہ مرمریں پریاں جن کی جلوہ گہ ناز میں تصور کا بھی مشکل سے گزر ہوتا ہے اُن ہی کی نرم اور معطر آغوش میں وہی حقیر اور ذلیل کتا ہوتا ہے جس کو ہم بدتمیز ڈھیلے مار کر بھگا دیا کرتے ہیں اور آفتاب کی وہ زرّیں شعاعیں اپنے دست رنگین ان ہی کتوں پر پھیرتی ہیں جن پر ہاتھ اتفاق سے پڑ جانے کے بعد ہمارا وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر تفصیل کے ساتھ سب کچھ بتایا جائے کہ نازنینانِ مغرب کتوں کے ساتھ کس کس طرح محبت کرتی کرتی ہیں تو شاید بہت سے ہندوستانی دل ہی دل میں جل کر کباب ہو جائیں۔ بہر حال مختصر طور پر صرف یہی کہہ دینا کافی ہے کہ حسن مغرب کے شراب ریز لبہائے رنگین محبت سے کانپتے ہیں، اور کتوں کے لعاب ریز لبوں سے پیوست ہو کر رہ جاتے ہیں ——— ارے توبہ، سچ ہے۔

قدر سگ انگریز داند یا بداند اُسکی میم

ہم غیر انگریز "سگ ناشناس" کتوں کی کیا قدر کر سکتے ہیں جنکو ہوش

سنبھالتے ہی یہ سبق پڑھا دیا گیا ہے کہ کتا ناپاک ہوتا ہے کتا رکھنا گناہ ہے۔ کتا رحمت کے فرشتوں کو گھر میں نہیں آنے دیتا۔ آخر یہ مہذب اقوام بھی تو عقل رکھتی ہیں وہ کیوں کتوں کو سر آنکھوں پر جگہ دیتی ہیں۔ ہم آپ جن کتوں کو بیکسی کی حالت میں سڑکوں پر پڑا ہوا اور راہگیروں کی ٹھوکریں کھاتا ہوا دیکھتے ہیں، اُن ہی کے بھائی بند جو خوش قسمتی سے یورپ یا امریکہ میں پیدا ہوتے ہیں حقیقتاً اشرف المخلوقات نظر آتے ہیں، ہم تو کہتے ہیں کتا کیسا ہی حقیر یا ذلیل کیوں نہ ہو لیکن اگر دنیا میں دنیا کا لطف اُٹھانے کے لیے کسی کو پیدا کرنا ہے تو فطرت کو چاہیے کہ مغربی ممالک کا کتا بنا کر پیدا کرے، ورنہ عذاب بھگتنے کے لیے ہندوستان کا کتا یا آدمی دونوں یکساں ہیں۔ دیکھتے جائیے وہ دن دُور نہیں جب ہندوستان کے تمام گلیوں میں پڑے ہوئے کتے مغربی ممالک میں پہونچ جائینگے، اِس لیے کہ وہاں کی ہر ماں کو اپنے یہاں بابا کے پیدا ہوتے ہی ایک پپّے کی ضرورت پیش آتی ہے، اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو تمام دُنیا کے کتے سمٹ کر مغربی ممالک میں عیش کی زندگی بسر کرینگے اور ہندوستانی عموماً اور مسلمان خصوصاً کتوں کو دیکھنے کے لیے ترس جائیں گے۔

واحد حاضر جمع غائب

واحد حاضر، جمع غائب

رسالوں کے ایڈیٹر صاحبان کو اپنے مضمون نگاروں کی طرف سے
ایک غلط فہمی ہمیشہ رہا کرتی ہے کہ وہ حسب فرمائش ہر وقت اُسی نمبر کا
اُسی ڈزائن کا اور اُسی ٹو کا مضمون تیار کر سکتے ہیں جسکی فرمائش کی جائے
لیکن ہمیشہ وہ مضمون دینے میں "وعدۂ وصل" کی طرح "فردائے قیامت"
سے کام لیتے ہیں، ایڈیٹر صاحبان کا یہ خیال ذرا غلط ہے۔ اس لیے کہ
مضمون نگار بیچارے سب نہیں تو کم از کم ہم بیچارے بعض وقت اپنی
حسب فرمائش مضمون لکھنے میں بھی ناکام رہتے ہیں۔ کاغذ حاضر،
قلم حاضر، دوات حاضر، تو دماغ غیر حاضر۔ اب دماغ حاضر ہوا تو کاغذ
قلم دوات غیر حاضر، اور واقعی بنارسی باغ میں قلم دوات کاغذ کیسے
حاضر ہو سکتے ہیں اور گھر میں جہاں قلم دوات کاغذ وغیرہ سب کچھ

اللہ کا دیا ہوا موجود ہوتا ہے وہاں دماغ اتفاق سے حاضر نہیں ہوتا
غرضکہ اسی حاضر غائب کی گردان میں مضمون ملتوی رہتا ہے۔ اگر
جمع حاضر ہے تو واحد غائب، اور اگر واحد حاضر ہے تو جمع غائب۔
لیکن اڈیٹر صاحب اس تاخیر سے سمجھتے ہیں کہ مضمون نگار صاحب
ناز، نخرہ، غمزہ کر رہے ہیں۔ اُن کو کیا معلوم کہ ایک مضمون لکھنے کے
لیے کتنی مرتبہ واحد حاضر اور جمع غائب کی گردان کرنا پڑتی ہے، اور
اسکے علاوہ بہت سی اُفتادیں اور بھی ہیں جو انسان پر آئے دن نازل
ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً اسی مضمون کا قصہ یہ ہوا کہ یکم ستمبر کو پہلا ارادہ کیا
کہ مضمون لکھیں۔ دو تین منٹ تک غور کیا، اسی غور و فکر میں
دماغ کہاں سے کہاں پہونچ گیا یاد آگیا کہ لاحول ولاقوۃ، عرصہ
ہوا کہ راز کا خط آیا تھا جواب نہیں دیا۔ پھر خیال آیا کہ جگر کے خط کا بھی
جواب نہیں دیا ہے اور ہاں اس نے اناؤ بلایا تھا اچھا اب کی اتوار کو
جائیں گے اتنے میں آگیا دھوبی اس سے پاجامہ کھونے کی شکایت،
قمیص پھاڑنے کے شکوے کالر پھوڑنے کے گلے شروع ہو گئے کھانے کا
وقت آیا وہ بھی ٹل گیا۔ ہاتھ دھو کر انگڑائی لیتے ہوئے ذرا آنکھ

جھپکا نے کو لیٹ رہے اور چار بجے کی خبر لی، اُٹھے غسل کیا، اور آوارہ گردی کو نکل گئے، غرضکہ تمام دن اور تمام رات صرف کر کے دوسری ستمبر کو پھر علی الصباح مضمون کا خیال آیا۔ حافظ محمد عالم صاحب کی برہمی کا افسوس ہوا خیال کیا کہ لاؤ فسانہ لکھیں، بس شروع کر دیا فسانہ ساتھ نام اللہ کے نام رکھا "ترپاہٹ" اور فسانہ لکھنا شروع ہوا، ماشاء اللہ کوئی دس منٹ میں پہلا باب ختم کر ڈالا، اور قلم رکھ کے ذرا کمر سیدھی کی بس فسانہ ختم اب سوچا اچھا ذرا لیٹ کے نظم کہیں، مصرعہ عرض کیا۔

"چاند کی ٹھنڈی شعاعیں لرزہ براندام ہیں"

دوسرے مصرعہ کے الفاظ ذہن میں اچھی طرح آنے بھی نہ پائے تھے کہ اُنھوں نے شانہ ہلا کر کہا "آج دفتر جانا ہے یا نہیں؟ نو بجنے کو ہیں"۔ بس جناب شاعری وغیرہ سب تشریف لے گئی، کپڑے پہنے، جلدی جلدی کھانا کھایا، چائے بہت گرم تھی اس کو یوں ہی چھوڑا اور ٹوپی پہنتے ہوئے یہ جا وہ جا دفتر پہنچ گئے۔ دفتر میں وہی روز کا چرخہ پانچ بجے گھر کو آئے تو دن بھر کے تھکے ہوئے تن بدن کا ہوش کہاں

پس چاروں شانے چت لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں، وہ انشر کی بندی پنکھا جھلاکی اور ہم کو خبر بھی نہ ہوئی۔ اب روز اسی طرح دفتر جاتے رہے، فسانہ کا ایک باب یا نظم کا ایک مصرعہ لکھا ہوا اب تک رکھا ہے اسکو پورا کون کرتا، ہم تو دفتر جاتے رہے اور دفتر سے آکر جو حال ہو جاتا ہے اس کو وہی مضمون نگار خوب سمجھ سکتے ہیں جو کسی روزانہ اخبار کے دفتر میں ہماری طرح نوکر ہوں۔ دن بھر سیاسی گتھیوں کے سلجھانے میں دماغ گاندھی کا چرخہ ہو جاتا ہے، پھر بیشی مضامین کس سے لکھے جائیں، مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری اور ارادہ برابر کرتے رہے کہ اب کی کوئی تعطیل آنے تو مضمون یا نظم لکھ ہی ڈالیں گے۔ تعطیل کون سی آتی، اخبار اور تعطیل، دو ایسی تلواریں ہیں کہ ایک نیام میں رہ ہی نہیں سکتیں، بہر حال خدا اتوار کو سلامت رکھے کہ ہفتہ بھر کا پروگرام اسی ایک دن پر ٹلتا ہے، نہانا، دھونا، کپڑے بدلنا، دوستوں اور عزیزوں سے ملنا، آنا جانا، مضمون لکھنا، غرضکہ سب کچھ اتوار کے دن کے لیے اٹھا رکھتے ہیں اور اتوار کو دن بھر حسرت سوتے ہیں۔ لیکن ابکی بالکل طے تھا کہ "عالمگیر" کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لکھیں گے۔ افسوس تو یہ ہے کہ اس

ارادہ کے ساتھ انشاء اللہ نہیں کہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جمعہ کے دن بخار ہو گیا۔ ہفتہ کو ۱۰۳ تک پہونچ گیا اور اتوار کو تو ڈاکٹر صاحب کا موٹر گھر پر کھڑا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نبض دیکھ رہے تھے۔ پیٹ دیکھ رہے تھے، سینہ ٹھوک بجا کر دیکھ رہے تھے، اور ہم ڈاکٹر صاحب کا مُنہ دیکھ دیکھ رہے تھے کہ دق تجویز نہ کر دیں۔ مگر اُنھوں نے ملیریا فرمایا۔ نسخہ لکھا، فیس تو ہمارے یہاں لیتے نہیں ہیں، یوں ہی چلے گئے۔ نسخہ پیا یعنی نسخہ کی دوا ایسی کڑوی اور تیز کہ بجائے حلق میں اُترنے کے پہلے دماغ میں تشریف لے گئی، پھر تیر کی طرح حلق سے اُتر کر تمام گلے میں شگاف کرتی ہوئی معلوم نہیں پیٹ کے کس حصہ میں پہونچی، مگر تمام بدن میں آتش سیال کی طرح ایک سوزش پیدا کر گئی۔ اب تک اُسکا مزہ یاد کر کے تمام بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دوزخ میں شاید یہی پانی کی جگہ گنہگاروں کو دی جائے گی۔ ہر تیسرے گھنٹہ کے بعد اِسکی ایک خوراک سے تواضع ہوتی رہی، کمبخت نے پیٹ ایسا صاف کیا کہ صرف آنتوں کا برآمد کرنا چھوڑ دیا، اور وہاں ڈاکٹر صاحب نے متاطعہ جوعی کا حکم بھی دیدیا صرف دودھ جس سے مجھ کو ہمیشہ نفرت رہی ہے استعمال کرنے کو فرمایا

مگر بخار اس سے بھی نہ گیا بلکہ ۱۰۴ ہو گیا۔ اور آخر کار ۱۰۵ تک پارہ پہونچ گیا۔ اب تو ہم ذرا مرحوم ہونے کے تصور میں گھبرائے۔ وصیت شروع کی۔ در و دیوار پر حسرت سے نظر ڈالی، کلمہ پڑھا اور سچے مسلمان کی طرح توبہ استغفار شروع کر دی، ڈاکٹر صاحب پھر طلب کیے گئے، اُنھوں نے پھر وہی نبض دیکھی قلب کی حرکت کا معائنہ کیا، زبان دیکھی، آنکھوں کے پپوٹے دیکھے اور فرمایا کہ بخار ملیریا نہیں ٹائیفائڈ ہے چودہ دن کے بعد اُتریگا۔ نسخہ تبدیل کر دیا۔ دوا آئی، نہایت خوشرنگ ہلکا ہلکا نارنجی رنگ کاگ کے کھلتے ہی وہ بھینی بھینی خوشبو آئی کہ کہ دماغ معطر ہو گیا، لیکن جیسے ہی مُنہ میں پہونچی معلوم ہوا کہ تیزاب پی لیا زبان اینٹھ کر رہ گئی، حلق جکڑ گیا، تمام بدن میں ایک برقی لہر دوڑ گئی۔ تھوڑی دیر تک تو حواس ہی بجا نہ رہے، جب کُلّی کی تو پتہ چلا کہ مزہ کیسا تھا کڑوا اور نمکین، کھٹا اور میٹھا، سب یکجا۔ خدا اس دوا سے اپنے ہر بندے کو بچائے ہم تو خیر بچے نہیں، لیکن ہمارے دوسرے برادران مُلک و ملّت اس دوا سے محفوظ رہیں۔ ہمارا تو یہ حال ہوا کہ شاید ملک الموت روح قبض کرنا بھول بھی جاتے مگر ہماری تیمار داری صاحبہ دوا کا وقت

نہیں بھولتی تھیں، جہاں پہلی خوراک کے تین گھنٹے ہوئے اور وہ اپنے ایک ہاتھ میں دوا کی شیشی اور دوسرے میں فیڈنگ کپ اور پان لیے سر پر موجود، نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے دوا کے اُن کی صورت سے متلی ہونے لگی۔ بخار ایسی تکلیف دہ چیز نہیں ہے اسمیں تو تھوڑا سا لطف بھی آتا ہے۔ بشرطیکہ سر میں درد نہ ہو، بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شراب ذرا زیادہ پی لی ہے۔ لیکن یہ دوا تمام نشہ ہرن کر دیتی ہے اوّل تو صرف کنین ہی کیا کم ہے اُس پر سے اور نہیں معلوم کیا کیا خرافات ملا کر اسکو مکمل زہر بنا دیا جاتا ہے۔ مُنہ کا مزہ مستقل طور پر کڑوا کر دینے والا میری رائے میں بخار نہیں ہوتا بلکہ یہ دوائیں ہوتی ہیں اور پھر معالج صاحب کس انداز سے پوچھتے ہیں "مُنہ کا مزہ کیسا ہے؟" جی چاہتا ہے کہ دوا کی ایک خوراک پلا کر کہے کہ "ایسا ہے"۔ روز ڈاکٹر صاحب کو حال لکھوا کر بھجوا رہے ہیں کہ شاید دوا بدلیں، لیکن جواب یہی ملتا ہے "دوا بدستور، غذا بند۔ اور یہ پوڈر صبح و شام پانی سے پیا جائے"۔ لیجیے دوا تو تھی ہی، ایک پوڈر کا بھی اضافہ ہو گیا، یعنی گئے تھے نماز بخشوانے، روزے بھی ساتھ ہو لیے۔ خیر پوڈر تو ایسی چیز نہیں ہے جسکا اثر دیرپا ہو۔ ایک

آدھ چھر چھری کے بعد جہاں پان کھایا پھر یاد بھی نہیں رہتا کہ پوڈر بھی کھایا تھا یا نہیں، لیکن دوا تو سوتے ہوئے بلکہ مرے ہوئے آدمی پر اگر چھڑک دی جائے تو گھبرا کر اٹھ کھڑا ہو، اور اگر زندہ کو پلا دی جائے تو ہوائی جہاز بن کر اڑ جائے۔ لیکن ہم ایسے سخت جان ہیں کہ دن میں تین مرتبہ پیتے ہیں اور دو تین مرتبہ منہ بنا کر ہاتھ پیر ادھر ادھر مار کر رہ جاتے ہیں لیکن نہ بخار کم ہوتا ہے نہ دوا چھوٹتی ہے۔ بخار کو دس دن ہوئے مگر کم نہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کے فرمان کے مطابق گویا چار دن کی مصیبت اور بھی لیکن گیارھویں دن بخار کم ہوا تھرمامیٹر کا پارہ خلاف عادت صرف ایک سو دو تک چڑھ کر رہ گیا، لیکن نہیں معلوم یہ کیا بات ہے کہ بخار کے کم ہونے سے ایک تو کمزوری کا احساس زیادہ ہوتا ہے دوسرے غصہ زیادہ آتا ہے۔ لہذا آج کمزوری زیادہ محسوس ہوئی اور بات بات پر غصہ آیا۔ سب سے زیادہ غصہ تو دوا کے اوقات پر آیا دوا پینے پر تو از روئے قاعدہ غصہ نہیں کر سکتے تھے، لہذا پان چھوٹا ہونے پر، بستر پر شکن پڑنے پر، ناک پر مکھی بیٹھنے پر، بچوں کے زور سے چلنے پر باری باری غصہ کرتے رہے، اتنے میں کسی نے کہدیا کرنل ہیں آ بتک

پانی نہیں آیا ہے۔ بس ہم نے میونسپلٹی پر، چیرمین پر، واٹر ورکس پر غصہ شروع کیا۔ پانی آگیا تو نل بند کرنے پر غصہ کیا۔ نل بند ہوا تو بند میں ٹپکنے پر غصہ کیا، غرضکہ جو بات مل گئی اُس پر غصہ کر لیا۔ حالانکہ کمزوری کی وجہ سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ لیکن پھر بھی غصہ کمزور آواز کو شاندار بنا دیتا تھا لہٰذا ہم گھر بھر کو سر پر اُٹھائے ہوئے تھے۔ جب ہم نے غصہ کی حد کر دی تو اُنھوں نے مجبور ہو کر کہا "اچھا بس ہو چکا غصہ، چپکے پڑے رہو" ہم کروٹ لیکر چپ ہو رہے۔ اب جو تھرمامیٹر لگایا گیا تو بخار وہی ایک سو تین تھا، سب نے کہا غصہ سے بڑھا لیا، کسی نے کہا کمزور تو ہو رہے ہیں اتنا بکنے کہ بخار بڑھ گیا، یہ کسی نے نہ کہا کہ ابھی دوا پی ہے دوا سے بڑھ گیا ہوگا۔ ایک سو تین بخار کے ہونے سے ہم پر وہی سابقہ کیفیت طاری ہوگئی کہ خاموش پڑے ہوئے اچھے ہو جانے کے بعد کی بدپرہیزیوں کا تصور کر کے دل خوش کرنے لگے کہ کوئی دعوت انشاء اللہ ناغہ نہ کرینگے بلکہ ان دوستوں کے یہاں ضرور جائیں گے جہاں پُرتکلف چائے سے تواضع ہو اُسکے ساتھ مٹھائیاں ہوں اور جب اچھے ہو جائیں گے تو لاہور جائینگے۔ حافظ محمد عالم صاحب عوت

ضرور کرینگے اور دوست بھی دعوت دینگے اتنی طویل علالت کا کفارہ ہو جائیگا، یہی غور کرتے کرتے غنودگی طاری ہوئی معلوم نہیں خواب میں کیا کیا دیکھا کہ ایکدم سے اُچھل پڑے، آنکھ کھُلی تو دوا کا وقت تھا فرشتہ دوا لیے کھڑا تھا "پی دوا" پیتے نہ تو کہاں جاتے، زمین سخت اور آسمان دُور - غرضکہ اسی طرح دو دن اور کٹے چودھویں دن صبح کو بخار نارمل تھا، بہت خوش ہوئے آج صبح دودھ کے ساتھ ایک ٹوسٹ بھی ملا لیکن غالباً اتنے دنوں تک مقاطعہ جوعی کرنے کے بعد آنتیں خشک ہو گئی تھیں ٹوسٹ کی طرف کچھ رغبت نہیں ہوئی۔ بہر حال کھایا اور رزاق مطلق کا شکر ادا کیا، ڈاکٹر صاحب کو خوشخبری لکھی، لیکن اسکے جواب میں بھی "دوا بدستور" حکم آیا۔ صبر کرکے رہ گئے۔ اس لیے کہ اب تو زیادہ سے زیادہ دو ایک دن کی بات اور تھی پھر ہم کو کون دوا پلاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہوں یا ہماری تیمارداری ہم کس کے ہاتھ آنے والے ہیں ابھی تو یہ حال ہے کہ خوشامد کرتے ہیں باتیں بناتے ہیں، مگر پھر بھی دوا پینا پڑتی ہے وہ دوا لائیں اور ہم نے خوشامد شروع کی کہ آپ کے رسالہ "سہیلی" کا دفتر بھی لاہور آگیا ہے، اُنھوں نے

جواب دیا کہ "معلوم ہے دوا پیجیے"۔ تبیجیے ہم نے تو اُن کی دلچسپی کی بات کہی تھی اُنھوں نے ٹکا سا جواب دیا کہ "معلوم ہے دوا پیجیے"۔ یہ بھی کوئی انسانیت ہے؟ مگر کیا کریں سب کچھ سہنا پڑتی ہے، بخار نارمل ہوا مگر کمزوری بڑھ گئی، نقل و حرکت سے معذور، بستر پر پڑے ایک ایک کا مُنہ دیکھ رہے ہیں۔ اچھے ادیب ہیں، اچھے شاعر ہیں، اچھے اسسٹنٹ اڈیٹر روزنامۂ "ہمدم" ہیں کہ نہ اُٹھنے کے نہ بیٹھنے کے، پندرھویں دن مونگ کی دال کی پتلی کھچڑی کھانے کو ملی، کھچڑی کھائی بہت ذرا سی مگر آنکھیں کھل گئیں سب سے پہلے مضمون کا خیال پھر حافظ محمد عالم صاحب کا خیال پھر "عالمگیر" کے خاص نمبر کا خیال بائیسکوپ کے فلم کی طرح ذہن میں آئے مگر اُٹھ ہی نہ سکے، شام تک متواتر ارادے کرنے سے دیوار کے سہارے تھوڑی دور اُس بچے کی طرح چلے جو چلنا سیکھ رہا ہو لیکن شکر ہے کہ اسکی طرح گرے نہیں، اور واپسی تو دو آدمیوں کے سہارے سے ہوئی۔ آج سترھواں دن ہے، تو ہم نے جس طرح بھی ہو لیٹے لیٹے یہ سطریں لکھ ڈالیں اب قلم رکھ کے جو آنکھیں بند کرکے لیٹیں گے تو معلوم ہوگا کہ آنجہانی ہو گئے اس لیے کہ کافی خستگی ہو چکی ہے۔ مگر

حافظ محمد عالم صاحب تو ہم کو بجھے ہوے ہیں۔ مضمون نگار، اُن کو کیا معلوم کہ مضمون نگار ٹائیفائڈ بخار میں مبتلا ہو کر بستر پر دراز بھی ہو سکتے ہیں، اُن کے ڈر کے مارے جو کچھ لکھا جا سکا ہے لکھا ہے، مگر یہ باور کرانے کی آخری کوشش کرتا ہوں کہ یکم ستمبر کا ارادہ جو اتفاق سے بغیر انشاء اللہ کے کیا تھا ابھی فسانہ کے ایک باب اور نظم کے ایک مصرعہ کی صورت میں بکس میں بجنسہ موجود ہے جو انشاء اللہ ہاں اب کی انشاء اللہ کر دیا معلوم نہیں کیا صورت پیش آئے تو انشاء اللہ وہ باب اور وہ مصرعہ آئندہ سالانہ نمبر کے لیے کام آئیگا۔ خاص نمبر کے لیے یہ لیجیے۔
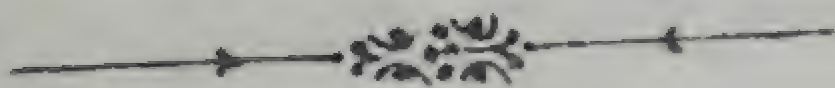
شاہکار

شاہکار

شاہکار کے معنی کون ایسا پڑھا لکھا ہے جو نہ جانتا ہوگا لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ بہت سے پڑھے لکھوں کو پنجاب کے رسائل نے باور کرا دیا ہے کہ شاہکار کے معنی سوائے چغتائی کی تصاویر اور پنجابی رسائل کے خاص نمبروں کے مضامین کے اور کچھ نہیں ہیں بلکہ بہت سے پنجابی رسائل کے ناظرین تو آنکھ بند کر کے شاہکار کے معنی یہ بتائیں گے کہ شاہکار اُس قلمی تصویر کو کہتے ہیں جو خطوط سے اس طرح بنائی گئی ہو کہ ٹانگیں حلق تک لمبی ہوں اور اوپر کا دھڑ جہاں سے شروع ہوا ہو وہیں پر ختم ہو جائے دُبلے پتلے اور لمبے ہاتھوں میں ہاتھوں سے زیادہ لمبی اُنگلیاں ہوں اور ہر اُنگلی اس جدوجہد میں نظر آئے کہ میں لبان میں بڑھ جاؤں، پیر اول تو نظر نہ آئیں اور آئیں تو ایسے کہ اُن کے لیئے اٹھارہ نمبر کے

جوتے کی ضرورت ہو۔ چہرہ بھی گھوڑے کی طرح لمبا ہو جس پر دہانہ کے خفیف سے نشان پر ایک لمبی سی ناک رکھی ہو اور آنکھیں بند ہوں لباس ایسا ہو کہ اُس کو کفن کے علاوہ اور کچھ نہ کہا جا سکے منظر ایسا ہو کہ طاق پر شمع روشن ہو جس کا پروانہ تصویر کی ناک پر تشریف فرما ہو اور بہ حیثیت مجموعی تصویر میں سوائے ناک کے کچھ نظر نہ آئے۔ ایسی تصویر کو شاہکار کہتے ہیں، یا شاہکار کے معنی یہ ہیں کہ ہر وہ مضمون جو لاہور اور امرتسر کے رسالوں کے سالناموں، سالگرہ نمبروں، عید نمبروں اور خاص نمبروں میں شائع ہو اُسکو مدیر رسالہ اپنے شذرات میں پیار سے شاہکار لکھتا ہے مختصر یہ کہ شاہکار کو کثرت استعمال نے جتنا مانوس بنایا ہے اُس سے کہیں زیادہ غیر مانوس بنا دیا ہے۔ اگر آج ہم شاہکار اس کے صحیح محل پر استعمال کرنا چاہیں تو سب ہم کو بیوقوف بنائیں گے۔ لہذا ہم بیوقوف بننے کے ڈر سے اس کا نام بھی نہ لیں گے اور ہماری خاموشی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب سو دو سو برس کے بعد زبان اُردو کی کوئی کتاب لغات مرتب ہوگی تو شاہکار کے معنی لکھے جائینگے کہ ایک ایسا ہما تو رتھا جو پنجاب میں پایا جاتا تھا، اور اب نایاب ہے۔

وہ تو کہیے کہ پنجاب کے رسائل نے شاہکار کے معنی ہمارے ذہن نشین کر دئے ہیں اور اُسکے کثرت استعمال نے ہم کو مجبور کیا کہ ہم اُسکے لغوی اور اصطلاحی دونوں معانی اپنے ذہن میں رکھیں ورنہ ہمارے پاس کوئی جواب ہی نہ ہوتا۔ جب ننھے سعید نے نہایت معصومیت سے پوچھا کہ "حضرت شاہکار علیہ الرحمتہ کون بزرگ تھے اور اُن کا مزار کہاں ہے؟" ہم نے اپنی واقفیت کی بنا پر اس سوال کا جواب معقول دیدیا۔ ورنہ سوائے اسکے کیا کہتے کہ "حضرت حافظ شیرازی کے چھوٹے بھائی کا نام شاہکار تھا۔ جن کے حالات سوائے میرے کسی کو نہیں معلوم" لیکن ہم نے سعید کو نہایت شفقت سے قریب بٹھا کر لکچر دینا شروع کیا کہ سنو:۔

"آج کا موضوع شاہکار ہے، یہ ایک لفظ ہے جس کو تم انسانی نام سمجھے۔ یہ کسی انسان، جانور، جگہ یا چیز کا نام نہیں ہے بلکہ ایک لفظ ہے جسکو انگریزی میں ماسٹر پیس MASTER PIECE کہتے ہیں اور جس کا تھوڑا بہت مفہوم لفظ کارنامہ سے ادا ہوتا ہے۔ اس لفظ کے معنی ہیں کارناموں کا بادشاہ، اس لیے کہ "کار" کہتے ہیں کام کو۔ اور اگر کار سے معنی موٹر کار لیے جائیں تو شاہکار کے معنی ہونگے "مسٹر فورڈ"

لیکن چونکہ یہاں اُردو زبان کے لفظ "کار" سے بحث ہے لہذا اس "کار" کے معنی ہیں کام اور جب اس میں "شاہ" لگا دیا گیا تو یہ ہو گیا "شاہ کام" یعنی "کاموں کا شاہ۔ اس کو اس طرح سمجھو کہ شلام نے اپنی اس مختصر زندگی میں سب سے بڑا کام یہ کیا ہے کہ اپنی ہوائی بندوق سے فاختہ مار ڈالی، اس فاختہ کے شکار کو تم اپنا شاہکار کہہ سکتے ہو، اسی طرح میرے شاہکار تم خود ہو، مہاتما گاندھی کا شاہکار چرخہ ہے مولانا محمد علی کے شاہکار مولانا شوکت علی ہیں۔ انگریزوں کا شاہکار کنگ پرائمر ہے۔ ہندوستان کا شاہکار تاج محل ہے۔ تاج محل کے شاہکار مولانا سیماب ہیں۔ مولانا سیماب کے شاہکار ساغر نظامی یا راز چاندپوری ہیں۔ اسی طرح ہر شخص کا کوئی نہ کوئی شاہکار ہوتا ہے، لیکن ایک شخص کے دو شاہکار تجاب میں تو خیر عام طور پر ہوتے ہیں لیکن غریب ممالک متحدہ آگرہ واودھ میں ذرا مشکل سے ہوتے ہیں غالباً اب سمجھ گئے ہو گے کہ شاہکار کس کو کہتے ہیں۔ تم کہتے ہو گے کہ تاج محل کیوں شاہکار ہے اور قطب مینار کیوں نہیں ہے۔ اس کو یوں ہی رہنے دو، بات یہ ہے کہ اس میں اپنی اپنی پسند کا سوال

آجاتا ہے بعض لوگ قطب مینار کو اپنا شاہکار کہتے ہیں بعض جامع مسجد کو، بعض کا خیال ہے کہ ڈاکٹر اقبال شاہکار ہیں اور بعض ڈاکٹر ٹیگور کو شاہکار کہتے ہیں تو بھائی اس قصہ کو اپنے دل پر چھوڑ کر ایک کو شاہکار سمجھ لو، اب دیکھو کہ تم شاہکار سمجھتے تھے کسی بزرگ کو جیسے شاہ مینا علیہ الرحمۃ یا شاہ پیر محمد صاحب وغیرہ لیکن شاہکار کوئی بزرگ نہیں اور نہ اسکا شمار شاہ دیک کے قسم کے کیڑوں سے ہے، یہ ایک لفظ ہے جسکے معنی تم سمجھ گئے ہو گے۔"

ہمارا یہ لکچر ایسا تھا کہ سعید تو خیر ماشاء اللہ ذہین ہے۔ اگر کسی پتھر کی مورت کے سامنے دیا جاتا تو وہ بھی لفظ "شاہکار" کی متبحر عالم ہو جاتی۔ لیکن ہم کو تعجب ہی ہوا جب سعید نے سب کچھ سننے کے بعد پوچھا کہ

"لیکن شاہکار تو ایک سدا سہاگن بزرگ تھے جو زنانہ لباس میں رہتے تھے۔"

ہم نے پھر متعجب ہو کر پوچھا کہ "اسکے کیا معنی ہوئے"۔ اس نے ایک پنجابی رسالہ ہمارے سامنے پھینک کر کہا "یہ دیکھیے اس میں

شاہکار کی تصویر ہے"۔ اب ہمارے لیے یہ سمجھانا بہت دشوار تھا کہ یہ شاہکار کی تصویر نہیں ہے بلکہ شاہکار تصویر کو کہتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے بھی کہہ دیا کہ پنجاب میں شاہکار تصویر کو کہتے ہیں اور باقی تمام ہندوستان میں اس کے معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کیے۔ اس نے کچھ اس طرح ان الفاظ پر اعتبار کیا گویا وہ مجھ کو جاہل سمجھ رہا تھا اور پاس ادب جاہل کہنے میں مانع تھا۔

سعید کو تو خیر ہم نے کسی نہ کسی طرح خاموش کر دیا مگر ہم کو اپنی نااہلی کا اعتراف ہے کہ اگر کسی پڑھے لکھے یا کسی پنجابی بھائی کو سمجھانا پڑے تو ہم کچھ نہیں سمجھا سکتے، اور واقعی کس طرح سمجھا سکتے ہیں۔ جب پنجاب کے کثیر الاشاعت رسائل نے ہم سے پہلے یہ اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا ہے کہ شاہکار ہندوستان کے مایۂ ناز مصور چغتائی کی تصویر کو کہتے ہیں، کم از کم ہم نے تو یہ طے کر لیا ہے کہ اگر پنجاب کے رسائل مانی اور بہزاد کے بھی کسی شاہکار کو شاہکار لکھ دینگے تو ہم بغیر دیکھے ہوئے اس تصویر کو دیکھ لیا کرینگے اور اگر ہمارے کسی مضمون کو پنجاب کے کسی رسالہ نے شاہکار لکھ دیا تو ہم اس مضمون کے متعلق اعلان کرینگے

کہ ہمارا مضمون نہیں ہے کسی نے ہمارے نام سے لکھدیا ہے۔ ایک غلط فہمی اور بھی امکان میں ہے کہ شاید لوگ یہ سمجھ بیٹھیں کہ ہم شاہکار سے چڑھتے ہیں۔ یا چغتائی کی تصویر ہم کو پسند نہیں۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں، چغتائی ہندوستان کا مایۂ ناز مصور ہے اور اُسکی تصاویر نہیں بلکہ وہ خود شاہکار ہے اور فطرت کا شاہکار ہے لیکن اسکی ہر تصویر کو شاہکار کہنا ایسا ہی ہے جیسے فوج کے ہر سپاہی کو کپتان صاحب یا پولیس کے ہر سپاہی کو داروغہ جی یا ہندوستان کے ہر شاعر کو ڈاکٹر اقبال کہنا، چغتائی کی تصویر بہترین سہی لیکن ہر ایک اُسکا شاہکار نہیں ہو سکتی اور اگر اسکی تمام تصاویر شاہکار ہیں تو واقعی شاہکار معنی ہیں چغتائی کی تصویر کے۔ اسی طرح ہم کو لفظ شاہکار سے چڑھ نہیں ہے لیکن شاہکار کو ہم امتیازی شان پیدا کرنے والا سمجھتے تھے اور پنجاب کے رسائل نے اُس کو عمومیت کی نشانی بنا دیا ہے کہ کسی کے مضمون کو برا نہ کہا، مہذب الفاظ میں شاہکار کہدیا تو جناب جب آم گھاس سب شاہکار ہیں تو پنجاب کے مدیران رسالہ جات تخبیں شوکت تھانوی کے مضامین کو شاہکار بنانے سے بکر اندیشہ ہے کہ تھوڑے دنوں میں یہ لفظ ایسے مدیر تخبیں کے بابرا ستعمال ہوگا۔ لوگ اسکو گالی سمجھا کرینگے۔

سودیشی ریل کے بعد

سودیشی ریل کے بعد

سودیشی ریل کے تعبیر نما خواب کے بعد ہم اندر جاکر سو گئے تھے اس لیے کہ آدھی رات کو اتفاقاً جاگ اُٹھنے والا آدمی اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ کسی مسئلہ پر غور و فکر کر سکے۔ اسی کو غنیمت سمجھنا چاہیے کہ آرام کرسی سے اُٹھ کر جب پلنگ پر گئے تو ہم نے اپنا سر تکیہ پر اور پیر اوڑھنی چادر پر رکھے تھے، ورنہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی نیند کا متوالا کسی وجہ سے آدھی رات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا ہے تو وہ نہایت اطمینان کے ساتھ تکیہ پر پیر اور چادر پر سر رکھ کر خراٹے لینا شروع کر دیتا ہے۔ بہر حال ہم نے ذرا ہوش کا ثبوت دیا اور انسانوں کی طرح لیٹ کر سو گئے، سونے کے بعد ہم نے وہ خواب تو نہیں دیکھا جس کا سلسلہ حقہ کی ڈاک کے مُنہ پر گرنے سے منقطع ہو گیا تھا، لیکن کچھ دیکھا ضرور

جو بے ربط سا تھا، مثلاً کبھی اپنے کو ہاتھی پر سوار دیکھا جو موٹر کی طرح
تیز چلتا تھا اور پڑھے لکھے اُردو داں کی طرح اپنی سونڈ کے نیچے والے
منہ سے نہایت فصاحت اور بلاغت سے اُردو بولتا تھا، کبھی یہ دیکھا
کہ ایک چیل ہم کو اپنے پنجوں میں دبا کر لے اُڑی ہے اور ہم املی کے درخت
سے اُلجھ کر اس کے پنجوں سے چھوٹ گئے ہیں، کبھی یہ دیکھا کہ ہم کو
چند خوفناک صورت کے انسان اپنے حلقے میں لیے دانت نکال
نکال کر ناچ رہے ہیں اور اپنے نیزوں سے دھمکاتے جاتے ہیں اور
اُنکا ارادہ ہے کہ اس ہیبت ناک رقص کے بعد ہم کو ما حضر بنا کر تناول
فرمائیں گے۔ مختصر یہ کہ اسی قسم کے مختلف اور بے ربط خوابوں کے بعد
ہم نے نہیں معلوم کیا دیکھا کہ ایک دم سے اُچھل کر بیدار ہو گئے۔ صبح
ہو چکی تھی، دھوپ پھیلی ہوئی تھی، لہٰذا ہم بھی ایک آدھ انگڑائی ایک
آدھ کروٹ ایک آدھ جماہی کے بعد آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔

حالانکہ رات کا خواب ہمارے دماغ میں چکّر لگا رہا تھا اور ہم
اس خواب کو ایک حد تک صحیح بھی سمجھتے تھے۔ لیکن معلوم نہیں کیوں
ہمارا دل بار بار یہی چاہتا تھا کہ ہم اپنی بیکاری کو ختم کر کے کھدّر میں لپٹے ہوئے

میدان سیاست میں کود پڑیں، اس دل چاہتے کی ایک وجہ تو یہ بھی کہ
کہ ہم بیکار تھے، دوسرے ہم کو یقین کامل تھا کہ ہم بغیر لیڈر رہے نہیں رہ سکتے
اور اگر ہم کھدر پہننے کے بعد لیڈر بن گئے تو کیا کہنا ہے۔ اس سب جسٹراری
اہلمدی، مویشی خانہ کی منشی گری، وکیل کی دلالی، میونسپلٹی کی محرری،
پولیس کی کانسٹبلی، ریلوے کی ٹکٹ کلکٹری وغیرہ سے تو بہرحال اچھے
ہی رہیں گے، اور پھر لطف یہ ہے کہ ان سب عہدوں کے لیے باوجود
پڑھے لکھے ہونے کے بغیر تمام ہندوستان کے منسٹروں کی سفارش کے
ہم قطعی نااہل ہیں۔ اگر ناک رگڑ کر مر بھی جائیں گے تو ہم کو ان جگہوں
میں کوئی جگہ بھی بغیر اونچی اونچی سفارشوں کے نہیں مل سکتی، اور ان
سفارشوں کا حاصل کرنا اس قدر دشوار ہے کہ اگر ہم اتنی ہی جدوجہد
تخت افغانستان کے لیے کریں تو ممکن ہے کہ جلالۃ الملک شہریار
غازی شاہ شوکت تھانوی خلد اللہ ملکہ و دولتہ ہو جائیں۔ یہ کیا کہ
منسٹر لوکل سلف گورنمنٹ اور آنریبل ہوم ممبر وغیرہ کی تو سفارشیں
حاصل کی جائیں، اور جس جگہ کی سفارش حاصل کی گئی ہے اس کی تنخواہ
پچیس روپیہ ماہوار ہے اور وہ بھی اس شرط پر کہ اگر ہم بی، اے ہیں

اور ہماری عمر بھی پچیس سال کے اندر ہے تو وہ جگہ ہم کو مل سکتی ہے ورنہ تمام جد و جہد بیکار، اب ہا لیڈر بننا اس کے لیے نہ کوئی عمر کی قید ہے نہ بارسوخ ہونے کی، نہ اس میں ذات پوچھی جاتی ہے نہ برادری بس سر سے لیکر پیر تک موٹے سے موٹے کھدر میں اپنے کو لپیٹنے اور پیروں میں چپّل پہننے کے بعد جس کا جی چاہے لیڈر بن سکتا ہے اور اس کے بعد ہر انسان اپنی استعداد کے مطابق ترقی کر سکتا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کی آواز بہت بڑی ہے اور وہ اپنے چہرہ میں جوش و خروش کے کیفیات پیدا کر دینے پر قادر ہے تو اُسکا لیڈر نہ بننا سخت قسم کی حماقت ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے چاروں طرف گھوم کر مختلف طریقوں سے اپنے ہاتھوں کو جنبش دے سکتا ہے تو وہ ایک کامیاب لیڈر ہو سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس وقت لیڈر بن جانا جیسا آسان ہے شاید کوئی دوسرا مشغلہ ایسا سہل نہیں ہے۔ یہی وہ تمام آسانیاں تھیں جو سوویشی ریل کا خواب دیکھنے کے بعد بھی ہم کو کشاں کشاں اپنی طرف کھینچ رہی تھیں اور ہمارے واسطے اس میدان میں گنجائش بھی کافی تھی، مثلاً یہ کہ ہم انگریزی اور اُردو میں ہر مبحث پر اُس سے جُدا ہو کر نہایت مناسب

تقریر کر سکتے تھے، ہم غصہ کا ایکٹ اس طرح کر سکتے تھے کہ شاید کوئی انتہائی غصہ والا بھی نہیں کر سکتا۔ ہم کو اپنے ہاتھوں کے علاوہ انگلیوں کو مختلف طریقوں سے جنبش دینے میں مہارت حاصل تھی۔ ہم اپنی آواز پر قادر تھے کہ جب چاہیں نہایت گرجتی ہوئی بنا دیں اور جب چاہیں نہایت نرم اور دھیمی کر دیں، یہاں تک کہ ہم آواز کو بھرائی ہوئی اور روتی بنا دینے میں بھی مشاق تھے۔ اب صرف ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم تقریر کے مخصوص الفاظ بیٹھ کر رٹ ڈالیں، اور یہ یاد کر لیں کہ کس لفظ پر ہماری اُنگلی کو کون سی جنبش ہونا چاہیے۔ اور آواز کا کون سا سُر ہو، یہ کوئی مشکل بات نہ تھی۔ تین چار مقرروں کی تقریریں سُن کر ہم سب کچھ سیکھ سکتے تھے۔ لہٰذا ہم نے کافی غور و فکر کے بعد طے کر لیا کہ خدا کا نام لے کر ہم کو لیڈر بن جانا چاہیے۔ اللہ نے چاہا تو اسی میں ایسی کامیابی ہو گی کہ یہ مہاتما گاندھی اور "نہرویں" وغیرہ سب منہ دیکھتے رہ جائینگے اور اگر زندگی نے وفا کی تو انشاء اللہ ایک دن ہم بھی کانگرس کے صدر ہو کر بتیس گھوڑوں کی گاڑی پر راجہ اندر بنے ہوئے نکلیں گے۔ اس قسم کے خیالات سے ہمارے تمام جسم میں ایک سنسنی پھیل گئی ہماری

آنکھیں خوشی کے مارے نکل آئیں اور ہمارا دل دھڑکنے لگا یہاں تک کہ مارے خوشی کے ہم اُچھل پڑے اور طے کر لیا بس ہم کو جلد سے جلد لیڈر بن جانا چاہیے۔ اب تک جو وقت بیکار گنوایا ہے وہی رونے کے لیے بہت کافی ہے۔ اگر پہلے سے ہم یہی کرتے تو اب تک کب کے مولانا رئیس الاحرار آقا، رفیق، شہریان، مہاتما وغیرہ بن کر نہیں معلوم کیا بن گئے ہوتے۔

ارادہ پختہ ہو اور انسان مستقل مزاج، تو کوئی وجہ نہیں کہ کامیابی حاصل نہ ہو۔ جس شخص نے دنیا کے نشیب و فراز اس طرح طے کیے ہوں کہ گویا ہزار دفعہ کوہ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی پر چڑھے اور .... وہاں سے جو پیر پھسلتا ہے تو سب سے گہرے خندق میں نظر آتا ہے اور پھر پہاڑ پر چڑھنا شروع کرتا ہے، اس سے پوچھیے وہ ترقی کا راز صرف مستقل مزاجی کو بتائے گا۔ حالانکہ اسی مستقل مزاجی کے پیچھے خندقوں میں گرتے گرتے خود بدولت کی ہڈیاں چور چور ہو گئی ہوں گی۔ لیکن اصول پھر بھی اصول ہے۔ ہڈیوں کا چور ہونا ایک با اصول انسان کو بے اصول نہیں بنا سکتا۔ جس کو آبلہ پائی کی اذیت کم ہمت بنا چکی ہو وہ وادی پُرخار میں قدم ہی کیوں رکھے گا۔ حالانکہ

آبلہ پائی کا علاج وہی خار مغیلاں ہیں جن کو دیکھ کر وہ لرزہ براندام ہوجاتا ہے۔ ہم جانتے تھے کہ ریشم کا سوٹ اتار کر ٹاٹ نما کھدر پہننے کے لیے ہم کو حقیقتاً ایثار کرنا پڑیگا۔ ڈاسن کے بوٹ کی جگہ چپل پہننا آسان کام نہیں ہے اور پھر اس وضع کو نباہ لے جانا تو ایک قسم کا معجزہ ہوگا۔ اور اگر نباہ نہ سکے تو دُنیا کو مُنھ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ گویا جس بات کا ہم ارادہ کر رہے تھے اس پر تمام زندگی قائم رہنا شرط اول تھی اور آپ جانتے ہیں کہ تمام زندگی کھدر پہن کر بسر کر دینے والا انسان معمولی قسم کے انسانوں سے ذرا مختلف ہوتا ہے۔ لیکن جس وقت یہ خیال آتا تھا کہ اس نفس کشی کے بعد ہم کیا ہو جائیں گے اور ہم کو دنیا کیا سمجھے گی اُس وقت ہم سب کچھ گوارا کر لینے کو تیار ہو جاتے تھے۔ خود ہمارا ذہن ہم کو سبز باغ دکھانا شروع کرتا تھا۔ کہ جب ہم برف کی طرح سفید کھدر میں ملبوس کسی جلسۂ عام میں پہونچیں گے تو حاضرین سرو قد کھڑے ہو کر "اللہ اکبر" اور "بندے ماترم" کے فلک شگاف نعروں سے ہمارا استقبال کرینگے۔ جب ہم پلیٹ فارم پر جائینگے تو "مولانا شوکت علی کی جے" کے نعرے پنڈال کو اڑائیں گے۔ جب ہم تقریر کرنے کھڑے

ہوں گے تو پھولوں کی بارش ہو گی اور ہم کو ہاروں میں چھپا دیا جائیگا۔ ہم مسکرا مسکرا کر دونوں ہاتھوں سے حاضرین کو سلام کرینگے اور حاضرین تالیاں بجا بجا کر ہم کو عزت پر عزت بخشیں گے، ہم تقریر شروع کریں گے تو بار بار تالیاں بجائی جائیں گی اور ہماری جے کے نعرے بلند ہونگے۔ ہر طرف سے لوگ ہماری تصویریں لیں گے۔ کسی تصویر میں ہم منہ کھولے ہوئے آجائیں گے، کسی میں منہ چڑھاتے ہوئے۔ کسی میں ہمارا ہاتھ اُٹھا ہوا ہو گا۔ کسی میں رقص کناں ہونگے۔ وہی تصویریں تمام اخبارات میں شائع ہونگی اور ہر طرف ہم ہی ہم ہونگے۔ اب بتائیے کہ کیا یہ خیالات ایسے ہیں جن کے فریب سے انسان بچ سکتا ہے، کم سے کم ہم سے تو یہ ممکن نہیں چنانچہ ہم نے جلسوں میں پابندی کے ساتھ جانا شروع کر دیا تاکہ مختلف قسم کی تقریریں سن کر ہم اپنی تقریر کا طریقہ ایجاد کر سکیں اس لئے کہ ہماری قسمت میں بھی لیڈر بننا لکھا ہوا تھا اور اگر نہیں لکھا ہوا تھا تو ہم خود لکھ رہے تھے اس لئے کہ تقدیر ہماری ذاتی تھی۔ بھانت بھانت کی تقریریں سننے کے بعد مقرروں کی مختلف نقل و حرکت کی مشق کر کے ہم نے اپنی تقریر کا ایک معجون مرکب طریقہ

ایجاد کیا اور اس طریقہ کی اپنا کمرہ بند کرکے دن رات مشق کی یہاں تک کہ ہم اپنے نزدیک موجودہ مقرروں میں سب سے بہتر مقرر ہو گئے۔ ہمارے اہل محلہ کو تو ہمارے لیڈر بننے کی خبر ہو ہی گئی تھی، اس لیے کہ جب ہم تقریر کرنے کی مشق کرتے تھے تو سارے محلہ کے بچے اور بڑھے ہمارے دروازے پر جمع ہو جاتے اور جب تک ہم دروازہ کھول کر "خیریت ہے" نہیں کہہ دیتے تھے سب لوگ جمع رہتے تھے، کسی کو شبہ تھا کہ ہم کو کوئی دورہ اُٹھتا ہے، کوئی اس خیال میں تھا کہ ہم پر جنوں کا سایہ ہے کوئی ہم کو مجنوں سمجھتا تھا اور کوئی مجذوب جانتا تھا لیکن ہم نے کبھی اس کی پرواہ نہ کی۔ اور اپنی دُھن میں برابر تقریر کی مشق کرتے رہے جب ہم کو پوری طرح یقین ہو گیا کہ اب ہم بالکل لیڈر بن سکتے ہیں تو ہم نے ایک ہنگامہ خیز تعارف کے ساتھ پبلک اور کانگرسی لیڈروں سے اپنے کو متعارف کرانا چاہا۔ اور اس کا طریقہ یہی مناسب سمجھا کہ ایک دن نہایت عمدہ ولایتی سوٹ پہن کر کسی عظیم الشان جلسہ میں جائیں اور وہاں ایک پُرجوش تقریر کرکے ولایتی کپڑوں کی ہولی اور سودیشی کپڑوں کی بسم اللہ کرنا بس اُسی دن سے گویا ہم لیڈر ہو جائینگے۔

تمام پروگرام مرتب ہو چکا تھا۔ بس جلسہ ہونے کا انتظار تھا۔ آخر وہ انتظار بھی ختم ہو گیا اور ڈھنڈورا سُن لیا کہ شام کو ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوگا جسمیں کوئی بڑے لیڈر کی تقریر ہوگی۔ بس ہم نے اپنا وہی سوٹ پہنا اور دن بھر کمرہ بند کرکے تقریر کی مشق کی، شام کو جلسہ گاہ میں جا پہونچے جہاں ہم کو نہایت آسانی کے ساتھ پلیٹ فارم کے پاس ہی جگہ مل گئی اس لیے کہ اس وقت تک جلسہ میں سوائے دریاں اور چاندنیاں بچھانے والوں کے اور کوئی بھی نہ تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ لوگ جمع ہونے لگے اور تھوڑی دیر کے بعد خاصہ مجمع ہو گیا۔ اور وہ لیڈر بھی "اللہ اکبر" اور "بندے ماترم" کے نعروں میں پلیٹ فارم پر تشریف لائے۔ پہلے تو ایک کھدر پوش بزرگوار نے ان حضرت کا تعارف کرایا، اور اس سلسلہ میں جو تقریر ارشاد فرمائی اس پر ہم دل ہی دل میں ہنسا کیے کہ یہ بھی کوئی تقریر ہے، تقریر ہے، تقریر وہ ہوگی جس سے میں اس جلسہ کو زیر و زبر کر دونگا۔ ان حضرت کی مختصر تقریر کے بعد "چرخہ کا تو تو بیڑا پار ہے" کی قسم کی نظمیں پڑھی گئیں اور اسکے بعد وہ لیڈر صاحب کھڑے ہوئے، ہر طرف پُر جوش تالیاں بجائی گئیں اور قومی نعرے بلند ہوئے۔ ہم ان تمام باتوں کو اس طرح دیکھ رہے

تھے، گویا یہ سب کچھ ہمارے واسطے بھی ہوگا۔ اور ہم نے اپنی جگہ طے کر لیا کہ ان حضرت کے بعد ہم تقریر کرینگے۔ لہذا ہم نے اُنکی تقریر بھی نہ سُنی اور دل ہی دل میں اپنی تقریر دُہرایا کیے۔ یہاں تک کہ اُنکی تقریر ختم ہو گئی، اب جو ہم نے دیکھا تو ہمارے ہاتھ پیر سرد ہو گئے تھے اور کچھ ہاتھوں کی اُنگلیوں میں رعشہ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، لیکن ہم نے دل مضبوط کر کے تقریر کی اجازت مانگی جو فوراً مل گئی اور ہم اسٹیج پر اس انداز سے پہونچے گویا تمام زندگی تقریریں کرتے رہے ہیں ہم نے مجمع کو دیکھا تو سب کی نظریں ہم پر اس طرح جمی ہوئی تھیں گویا ہم عجیب و غریب قسم کے جانور ہیں ہم نے تقریر شروع کرنے کے ارادہ میں تقریباً دس منٹ گزار دیے آخر آنکھیں بند کر کے کہنا شروع کیا:۔

"معزز خواتین! میں سب سے پہلے آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ——

ہر طرف قہقہوں اور تالیوں کی صدا بلند ہوئی، ہم اور اکڑ گئے۔ لیکن جناب صدر کو رشک پیدا ہوا اور اُنھوں نے للکار کر "خاموش" کہا۔ کچھ لوگ چپ ہو گئے اور کچھ بدستور چیرز دیتے رہے۔ میں نے پھر کہا:۔

"معزز خواتین!" —— یہ کہنا تھا کہ پھر ایک طوفانی کیفیت پیدا ہو گئی،

اور ایکی مرتبہ ہم نے بھی محسوس کرلیا، کہ اس ہنگامہ کی وجہ کیا تھی واقعی یہ ہماری غلطی تھی کہ ہم اس جلسہ میں "خواتین" کہہ بیٹھے، جہاں اتفاق سے کوئی خاتون بھی نہ تھی، لیکن جاہل حاضرین جلسہ کو اسکی خبر نہ تھی کہ تقریر کا یہ قاعدہ ہے کہ "خواتین" ضرور کہتے ہیں۔ بلکہ یہ طریقہ تو انگریزی میں بھی رائج ہے کہ وہاں "لیڈیز" بالکل اس طرح کہا جاتا ہے گویا "بسم اللہ الرحمن الرحیم" اسکے بعد تقریر شروع کی جاتی ہے، بہرحال ہم نے حاضرین کی جہالت پر دل ہی دل میں افسوس کرنے کے بعد کھنکھارتے ہوئے کہا:۔

"میں سب سے پہلے آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ مانچسٹر کہاں ہے؟ یہ ایک مقام ہے غالباً یورپ میں یا امریکہ میں، بہرحال ولایت میں، اور اس میں ولایتی کپڑے اس طرح بنتے ہیں کہ وہاں کے لوگوں کو آپ کے کھدر کی ضرورت نہیں باقی رہتی، بلکہ آپ خود اُن کا بنایا ہوا کپڑا پہنتے ہیں اور اُسی کپڑے کو آپ کے مہاتما گاندھی اور میں سب لیڈر بدیشی کپڑا کہتے ہیں ــــــ ہاں تو میرا مطلب یہ ہے کہ میں بھی بدیشی کپڑا پہنے ہوں، یہ سوٹ یعنی ٹائی کالر بلکہ کوٹ پتلون سب بدیشی ہیں۔ ــ یہ سوٹ بڑا قیمتی ہے اور پتلون کا کپڑا ہیں سولہ روپے

پانچ آنے گز خریدا تھا، اور پھر سلائی دی، یعنی انگریزی کارخانہ کی
سلائی جو کپڑے سے زیادہ تھی، جب میں نے اس سوٹ کی تیاری
کے بعد میزان کل کا خانہ بھرا ہے تو تقریباً سو روپیہ ہوتے تھے لیکن
آج میں یہ بیش قیمت سوٹ ملک و قوم کے لیے ہندوستان کی
بھارت ماتا کے لیے، آپ حضرات کے لیے سب کے سامنے جلاتا ہوں
آپ لوگ مجھ کو دیکھ کر سبق حاصل کریں، میں آج اپنی قوم کی خاطر
لیڈر بننے کے لئے میدان میں آ گیا ہوں (قہقہہ) اب میں اپنی جان پر
کھیل کر لیڈر بن رہا ہوں، آپ حضرات اگر مجھ کو کانگرس کا عہدہ
بنا دیں تو میں بھارت ماتا کے سپوتوں کے خون سے بھارت ورش
کو سینچ کر دکھا دونگا (قہقہہ) مادر ہند کے سعادتمند بیٹوں کی طرح
آپ کا فرض ہے کہ آپ جس طرح بھی ہو سکے جیل جائیں، اور
سزایافتگی کا تمغہ حاصل کر کے (قہقہہ، قہقہہ، قہقہہ)

(کرسی صدارت سے خاموش، خاموش، حضرات خاموش کی پے در پے
صدا، اور مجھ سے بیٹھ جانے کی استدعا) لیکن میں جوش میں تھا،
میں نے پھر مٹھی باندھ کر کہنا شروع کیا۔

حضرات! دیکھیے آپ کو چاہیے کہ آپ جھوٹ نہ بولا کریں، نماز پڑھا کریں، بڑوں کا ادب کیا کریں، ورزش کریں، ہلکی غذا کھائیں اور جلد اُٹھا کریں۔ اپنے لڑکوں کو اسکول نہ بھیجیں ورنہ وہ بد پرشی ہو جائیں گے۔ میری یہ نصیحتیں یاد رکھیے وقت پر کام آئینگی۔

آمادہ بہ قتلِ من آں شوخ ستمگارے
ایں طرفہ تماشا بیں ناکردہ گنہگارے

میں اپنی تقریر کے بعد رومال سے پسینہ پونچھتا ہوا پلیٹ فارم سے نیچے اُتر آیا۔ مجمع نے پُرجوش چیرز دئیے۔ بلکہ سیٹیاں بھی بجائیں اور ایک آدھ مرتبہ "ونس مور" بھی کہا۔ میں اپنی کامیابی پر خوش تھا مگر میرے مزاج میں ہمیشہ سے انکسار ہے۔ لہٰذا گردن نیچی کیے بیٹھا رہا۔ جلسے کے بعد کثیر التعداد لوگوں نے مجھ کو حلقہ میں لے لیا جس میں اسکول کے طالب علم بہت تھے۔ سب میرے نیک مشوروں سے خوش تھے اور مجھ سے مصافحہ کرنے کے لیے بے چین۔ میں اپنا سوٹ اُتار کر کھدر پہن چکا تھا اور اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا لیڈر معلوم ہو رہا تھا۔ میرا سوٹ میری میری نظروں کے سامنے جلانے کے لیے رکھا گیا اور آگ لگا دی گئی۔ میرا

مردانہ وار اس منظر کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ دھواں ہونے کے بعد دفعتاً ایک آگ بھڑک اُٹھی۔ اُس وقت مجھ سے نہ دیکھا گیا میں نے اپنی نظریں پھیر لیں۔ لیکن زبان سے اُف بھی نہ کی، لوگ مجھ پر گرے پڑتے تھے اور میں پسا جاتا تھا۔ لیکن اس احساس سے خوش تھا کہ یہ لوگ اپنے جذبۂ عقیدتمندی سے مغلوب ہو کر سب کچھ کر رہے ہیں۔ مجھ کو اس قسم کی خوشی یا تو اپنی شادی میں ہوئی تھی جب میں دولہا بنا ہوا بارات میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا تھا، یا آج مجھکو محسوس ہو رہا تھا کہ یہاں بس میں ہی میں ہوں، لوگ مجمع کو ہٹاتے ہوئے مجھ تک آتے تھے، کوئی تو میری داڑھی پر ہاتھ پھیرتا تھا کہ "مولانا اس کو اور بڑھا لیجیے"۔ میں اسی شان لیڈری میں جواب دیتا تھا۔ "انشاء اللہ بھائی انشاء اللہ"۔ کوئی میری تقریر کی تعریف کرتا کہ "سبحان اللہ کیا مسلسل تقریر فرمائی ہے"۔ اور میں مسکرا کر شکریہ ادا کرتا، کوئی مجھ کو نہایت ادب سے سلام کرتا تھا جسکا جواب میں گردن کی جنبش سے دیتا تھا۔ اس لیے کہ دونوں ہاتھ تو مصافحہ میں مصروف تھے، مختصر یہ کہ مجمع تمام وہ حرکتیں کر رہا تھا جو عقیدتمندوں کو کرنا چاہیے۔ اور میرا طرز عمل بالکل لیڈرانہ تھا، میں

اسی مجمع میں گھرا ہوا آگے کی طرف کھسک رہا تھا اور میرے ساتھ ساتھ مجمع بھی آگے بڑھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ میں جلسہ گاہ سے نکل کر اس شمع کی طرح سڑک پر آ گیا جس کے چاروں طرف برسات کے زمانہ میں پروانوں کا ہجوم ہو۔ میرے ایک دیرینہ کرم فرمانے میری شان اور بھی بڑھا دی کہ اپنا موٹر لیکر میری طرف بڑھے اور مجھ کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں "لیتا ہے، لیتا ہے" کے پُرجوش قومی نعروں کے درمیان موٹر پر نہایت تیزی کے ساتھ مجمع سے نکل گیا۔

اس کامیابی نے قدرتی طور پر مجھ میں ایک غرور پیدا کر دیا تھا مجھ کو محسوس ہو رہا تھا کہ میں عام سطح سے بلند انسان ہوں بلکہ مجھ کو معلوم ہو رہا تھا کہ گویا تمام ہندوستان میرے سامنے جھکا ہوا ہے اور میں اپنے ہاتھ سے جھکے ہوئے سروں کو اُٹھا رہا ہوں۔ مجھ کو یقین تھا اور کامل یقین تھا کہ اگر مہاتما گاندھی میرے مشوروں پر چلے تو ہندوستان غلام نہیں رہ سکتا۔ مہاتما گاندھی کو میرے مشوروں پر چلنا پڑیگا اور وہ بغیر میرے کچھ نہیں کر سکتے، آج کی تقریر کے بعد میرے پجاریوں کی تعداد اُنکے پجاریوں سے کہیں بڑھ گئی ہے۔ اگر آج میں اس مجمع سے کہہ دیتا کہ سوراج لے لو۔ تو

یہ لوگ یقیناً لے لیتے۔ لیکن میری مصلحت یہی تھی کہ جناب گاندھی صاحب مجھ سے میری مدد مانگیں اور میں اُن سے کہوں کہ "پہلے ہاری مان لو اور کہدو کہ میری حمایت کے بغیر تم سے کچھ نہ ہو سکا۔ اب آپ میری مدد کیجیے" پھر تو میں ایک اشارہ میں سوراج دلوا دونگا۔ میں اپنے انہی خیالات میں محو تھا کہ میرے موٹر والے دوست نے کہا:۔

"یہ سوجھی کیا تھی"

میں۔ "آفتاب بادلوں میں زیادہ عرصہ تک چھپا نہیں رہتا"

دوست۔ "یعنی؟"

میں۔ "یعنی کیا؟ جو کچھ ہوا وہ تم نے دیکھ ہی لیا، تم کو فخر کرنا چاہئے کہ میں تمہارے موٹر پر بیٹھا ہوں اور تمہارا دوست ہوں"

دوست۔ "مجھ کو تو شرم آتی ہے"۔

میں۔ "خیر تم تو مذاق کرتے ہو۔ مگر تم نے دیکھ لیا کہ میں کس مرتبہ کا انسان ہوں"۔

دوست۔ "ہاں مجھ کو یہ امید نہ تھی کہ تم"

میں۔ "بات یہ ہے کہ میں خاموش بہت رہتا تھا؟"

دوست۔ "نہیں میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میں تم کو اتنا بیوقوف نہیں سمجھتا تھا"

میں۔ "کیا کہا؟ بیوقوف؟"

دوست۔ "یہ میری رائے نہیں۔ اس مجمع کی رائے ہے جسکو بنا لیا بیوقوف مل گیا۔"

میں۔ "کیا بکتے ہو؟ ہر وقت مذاق اچھا نہیں ہوتا، سچ بتاؤ کہ میری تقریر کیسی تھی؟ لوگ تھرا گئے ہونگے۔"

دوست۔ "سب ہنس رہے تھے کہ یہ عجیب قسم کا جانور ہے۔"

میں۔ "پھر وہی مذاق، ایمان سے کہو تم نے ایسی تقریر سنی ہے کبھی۔"

دوست۔ "اسمیں تو شک نہیں کہ یہ آج پہلا اتفاق تھا، لیکن اگر میں تم کو نہ لے بھاگتا تو لوگ نہ معلوم کیا گت بناتے۔"

میں۔ "خیر وہ بیچارے اپنے جذبات سے مجبور تھے۔ اُنکا دل چاہتا تھا کہ میرے قدموں کے نیچے کی خاک بن جائیں۔"

دوست۔ "مجھ کو تم سے ایسی اُمید نہ تھی کہ تم اس قدر بجیں ثابت ہوگے تم کو اتنا احساس بھی نہ ہوا کہ ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں تم کو بیوقوف بنایا گیا، تمھارا مذاق اُڑایا گیا اور تم برابر حماقت پر حماقت کرتے رہے، میں حیران ہوں کہ آخر تم کو سوجھی کیا

تھی ؟۔ اور اب تک تمہارا دماغ صحیح نہیں ہوا ہے۔"

میں۔ "تمہارا مطلب کیا ہے، تم تو کچھ دنوں سے معلوم ہوتے ہو"۔

دوست۔ "مطلب یہ ہے کہ تم نے جس مضحکہ خیزی کا ثبوت دیا ہے وہ تمسخر کی حد سے گزر کر قابلِ افسوس بن گیا۔"

میں۔ "یعنی قوم کے لیے ایثار کرنا مضحکہ خیزی ہے۔ تم بڑے نادان و جاہل ہو، اخبار پڑھا کرو۔"

دوست۔ "قوم کے لیے ایثار اس طرح ہوتا ہے کہ انسان جوکر بن جائے۔ آپ نے تقریر فرمائی ہے کہ کامک کا پارٹ کیا ہے۔"

میں۔ "تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ اگر ہندوستان میں تمہارے ایسے جاہل لوگ نہ ہوتے تو یہ مصیبت نہ ہوتی۔"

میرے گھر کے قریب موٹر ٹھہر گیا۔ اور میں اپنے دوست سے رخصت ہو کر گھر پہنچا جہاں پہلے سے میرے دوستوں کا مجمع مجھے مبارکباد دینے کے لیے موجود تھا۔ میرے پہونچتے ہی سب کھڑے ہو گئے میں سلام کرتا ہوا اپنی آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور میرے بعد میرے سب دوست بھی بیٹھ گئے۔ اس میں شک نہیں کہ آج میرا مرتبہ بہت بلند تھا۔ لیکن

بے تکلف دوستوں سے خدا بچائے، یہ لوگ بلند و پست سب کو ایک لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔ ان کے نزدیک میں اب بھی تھرڈ کلاس کا انسان تھا۔ ایک صاحب کہنے لگے۔

"مہاتما جی، رئیس الاحرار، شریمتی، مولانا، کیا کیا کہوں میں آپکو"۔

میں۔ "ان سب میں فرق ہے، مہاتما جی اوّل تو مہاتما گاندھی کے لئے مخصوص ہو چکا ہے۔ دوسرے میں مسلمان ہوں، رئیس الاحرار آپ کہہ سکتے ہیں اور شریمتی تو عورتوں کے لیے ہے، مولانا بھی کہا جا سکتا ہے"۔

دوسرے صاحب۔ "مگر تقریر تو ایسی تھی کہ آپ کو جو کچھ نہ کہا جائے کم ہے"۔

میں۔ "مجھے خود حیرت ہے کہ اُمید سے زیادہ کامیاب رہی"۔

تیسرے صاحب۔ "یعنی آپ خوش بھی ہو رہے ہیں"۔

میں۔ "خوشی کی بات نہیں، میں تو اس اتفاقی کامیابی کو کہتا ہوں"۔

چوتھے صاحب۔ "یہ لوگ تمھارا دماغ خراب کر دینگے اور رہی سہی جو کمی ہے وہ بھی پوری ہو جائیگی۔ آج آخر تم پر یہ کیا مار پڑی تھی کہ ہزاروں آدمیوں میں اپنی ہنسی اُڑوائی"۔

میں۔ "ہنسی اُڑوائی کیا معنی؟"

وہ۔ "ہاں تم سے کس نے کہا تھا کہ تقریر کرو اور حماقت مآبی کا ثبوت دو۔"

میں۔ "کیا تقریر بُری تھی کچھ؟"

وہ۔ "جی نہیں، بہت اچھی تھی مگر خدا کے واسطے اب حماقت نہ فرمائیے گا۔"

میں۔ "یعنی خواہ مخواہ۔"

وہ۔ "ارے عقل کے پوٹ سب نے تجھ کو تماشا سمجھا تھا۔"

میں۔ "کس قدر تالیاں بجائی گئیں، کس قدر لوگوں میں جوش پیدا ہوا۔ کس قدر نعرے بلند کیے گئے، اور تم کہتے ہو یہ نہیں وہ۔"

وہ۔ یہی سب کچھ ایک پاگل کے ساتھ ہوتا ہے جسکو آپ اپنی تعریف سمجھ رہے ہیں، وہاں آپ بنائے جا رہے تھے۔ تمام مجمع آپ پر ہنس رہا تھا اور آپ تھے کہ خبطی کی طرح اپنی دُھن میں مست تھے۔ دل تو چاہتا تھا کہ اُسی بھرے ہوئے جلسہ میں اسٹیج پر جا کر تمھارا منھ بند کردوں، کیا کروں مجبور تھا، معلوم نہیں کس طرح اب تک ضبط کیا اور تم ہو کہ اب تک تم کو ہوش نہیں آیا ہے۔"

میں۔ "یعنی بکے جارہے ہو، آخر ہوا کیا؟ ۔میں نے کون سی ایسی بُرائی کی ہے جس پر آپ کا۔۔۔۔۔۔"

وہ۔ "میرا کیا نقصان ہے۔ میں تو تمھاری بھلائی کے لیے کہتا ہوں ایک آدھ اسی قسم کی تقریر کرنے کے بعد تم خود دیکھ لینا کہ تم کو پاگل خانے بھیجنے کی فکر ہونے لگیگی۔ واللہ آج تو تم نے حد کر دی"

میرے سب دوستوں نے یک زبان ہوکر مجھ کو کچھ اس طرح بُرا بھلا کہا کہ اب مجھ کو بھی اپنے پاگل ہونے کا یقین ہونے لگا۔ وہ لوگ تو لعنت ملامت کی بوچھار میں مصروف تھے۔ اور یہاں میری دماغی کیفیت یہ تھی کہ کبھی تو کھدر کے کرتہ کا گریباں تار تار کرنا چاہتا تھا، کبھی ان سب دوستوں کو مار کر بھاگ جانے کا ارادہ کرتا تھا، کبھی دل چاہتا تھا کہ اس زور سے چیخنا شروع کردں کہ ان سب کی زبان از خود بند ہو جائے۔ کبھی رونے کی ٹھہراتا تھا اور کبھی گانے کی۔ لیکن پھر میرا دل کہتا تھا کہ نہیں یہ لوگ حاسد ہیں۔ میری کامیابی نہیں دیکھ سکتے۔ آج مجھ کو جو ترقی حاصل ہوئی ہے اسکو دیکھکر ان سب کے کلیجہ پر سانپ لوٹ گیا۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں ان ہی کی طرح جاہل کندۂ ناتراش بنا رہوں۔ اور اسی طرح اپنی

قیمتی زندگی کو برباد کروں۔ آج میری ذات سے ملک و قوم کو کیسی کیسی امیدیں ہیں۔ اگر میں ان جاہلوں کے کہنے میں آگیا تو قوم کی رہنمائی کون کریگا، میں لیڈر ہوں میرا فرض ہے کہ اپنے ملک کی رہنمائی کے لیے ہر طرح کی مخالفت کا مقابلہ کروں۔ یہ تو دوستوں کی مخالفت ہے، مجھ کو تو ابھی تمام دنیا کی مخالفت کا مقابلہ کرنا ہے۔ گورنمنٹ کی مخالفت کرونگا۔ مگر گورنمنٹ کی مخالفت میں جیل جانا پڑیگا۔ اور جیل میں چکی پینا پڑیگی۔ اوّل تو خدا وہ وقت نہ لائے اور اگر خدانخواستہ ایسا ہوا بھی تو میں ہندوستان کا واحد لیڈر بن جاؤنگا۔ میری جے کے نعرے بلند ہونگے۔ میرا نام لے کر میری قوم کا ایک ایک فرد اُٹھا اور بیٹھا کرے گا۔ اور اگر سوراج مل گئی یا مل گیا تو میں ہی ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا جاؤنگا۔ اُس وقت میں ان نادان دوستوں سے پوچھونگا کہ اب کیا کہتے ہو، اِس وقت تو اُن کے مُنہ لگنا اپنی بات کھونا ہے۔ اسوقت اُن کا جو جی چاہے کہہ لیں۔

میرے دوست مجھ کو خاموش دیکھکر سمجھے کہ شاید انکی نصیحت کا میں اثر قبول کر رہا ہوں۔ چنانچہ ایک صاحب نے فرمایا:۔

"اب تو سمجھ میں آگیا ہوگا کہ کیا حماقت سرزد ہوئی"۔

دوسرے۔ "اب بھی سمجھ میں آجائے تو غنیمت ہے۔ ابھی کچھ نہیں گیا ہے"۔

تیسرے۔ "انسان سے غلطی ہوتی ہے۔ اس بیچارے سے بھی چوک ہوگئی"۔

چوتھے۔ "نہیں، ان کو اگر ملکی کاموں میں حصّہ لینا ہے قوم کی خدمت انجام دینا ہے تو اس کا یہی طریقہ تو ہے نہیں کہ بس تقریر کردی اور لوگوں کو اپنے اوپر ہنسوا لیا اور سیکڑوں ٹھوس کام ہیں۔ مثلاً یہ کانگریس کے رضاکاروں میں بھرتی ہوجائیں، نمک بنائیں اور اس سلسلہ میں جیل جائیں۔ بہرحال یہ ایک کام ہوگا۔ لیکن یہ تقریر کا تو کوئی تک ہی نہیں ہے۔ جب ایک بات آپ کو نہیں آتی تو آپ اسکو اختیار ہی کیوں کرتے ہیں"۔

میں نے ان لوگوں کی باتوں کو تو ہاں ہوں کرکے ٹال دیا کہ کسی طرح جان بچے۔ لیکن دل تو یہ چاہتا تھا کہ ان جاہلوں کو اپنے مکان سے کان پکڑ کر نکلوا دوں، بدتمیز کہیں کے کہتے ہیں کہ رضاکاروں میں بھرتی ہوجاؤ۔ ان نالائقوں سے کوئی پوچھے کہ مہاتما گاندھی

رضاکاروں میں بھرتی ہوئے تھے؟ - کیا پنڈت موتی لال نہرو شروع ہی سے لیڈر رہے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ہم لیڈر نہ بنیں اور رضاکار بن جائیں - اور پھر کہتے ہیں یہ لوگ کہ نمک بناؤ - اگر ہم کو کچھ بنانا ہی ہے تو شکر کیوں نہ بنائیں، ملائی کی برف کیوں نہ بنائیں - آم کا اچار کیوں نہ بنائیں، بنائیں بھی تو کیا نمک؟ سبحان اللہ جس کا بنانا اور نہ بنانا سب یکساں ہے، مگر یہ بیچارے مجبور ہیں - ان کا تخیل ہیں نمک تک ہی پرواز کر سکتا ہے - اس سے زیادہ نہیں - اب ظاہر ہے کہ اس قسم کے مشورے دینے والوں کی کسی بات پر عمل کرنا کس قدر خطرناک ہے - یہ لوگ جاہل بھی ہیں اور بیوقوف بھی، ان کی باتوں پر تو بس ہنس دینا چاہیے۔

میرے دوست رخصت ہو چکے تھے اور میں تنہا بیٹھے بیٹھے گھبرا گیا تھا - سونے کا ابھی وقت نہ تھا - لہذا بازار کی سیر سب سے مناسب معلوم ہوئی اور میں گھر سے نکل کر بازار کی طرف چل دیا - پہلے تو میں خود اپنے کو عجیب و غریب معلوم ہوا - بات یہ ہے کہ نہ چپل کی عادت تھی نہ لمبے کرتہ کی - معلوم ہو رہا تھا کہ غسل خانہ سے نکل کر سڑک پر آگیا ہوں - خود میرا کتا مجھ کو دیکھ کر بھونک چکا تھا لیکن وہ تو پھر بھی جانور تھا - راستے میں جتنے

انسان ملے سب نے مجھ کو اس طرح دیکھا گویا میں کوئی غیر جنس ہوں جس کو دیکھیے میری طرف انگلی اُٹھا کر کچھ کہتا تھا اور ہنستا تھا۔ میں اس انگشت نمائی کے معنی سوائے اسکے اور کیا سمجھ سکتا تھا کہ وہ لوگ میری زندگی کے اس انقلاب پر متحیر تھے۔ راستہ میں ایک آدھ شخص نے مجھ کو ہنس کر سلام کیا، اور میں نے جواب دیا۔ لیکن جب بازار میں مجھ کو دیکھکر لوگوں نے واقعی تماشہ بنا لیا اور ہر طرف سے میری جانب اُنگلیاں اُٹھنے لگیں تو میں خود گھبرا کر ایک گلی میں گھس گیا، کچھ لوگ میرے پیچھے دوڑے اور مجھ کو گلی میں آکر گھیر لیا۔ میں نے زبردستی اپنے کو سنجیدہ بنا کر کہا:۔

"آپ حضرات کیا چاہتے ہیں۔"

سب یک زباں ہو کر:۔ "آپ ہمارے رہنما ہیں۔ آپ ہمارے لیڈر ہیں، ہم تو آپ کے مشورے سُننے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔"

میں۔ "لیکن یہ کون سا وقت ہے۔"

وہ لوگ:۔ "آپ کی تقریر سے سیری نہیں ہوئی ہم کچھ اور سُننا چاہتے ہیں۔"

میں۔ "تو پھر کبھی سہی، بہر حال اب تو وقت نہیں ہے۔"

اُن میں سے ایک :۔ "ارے یار جانے بھی دو، کیوں تنگ کرتے ہو۔"
دوسرا۔ "واہ یہ ہمارے لیڈر ہیں۔"
تیسرا۔ "چھوڑ دو، بیچارے کو جانے دو۔"
چوتھا۔ "اجی لیڈر صاحب آپ تو تقریر کیجیے۔"
میں۔ "اچھا آپ لوگ پیچھے ہٹ جائیں۔"

سب تھوڑا تھوڑا پیچھے ہٹ گئے۔ اور میں بھی تھوڑا سا اُن سے پیچھے ہٹا۔ میں نے اپنی چپلیں اُتار کر ہاتھ میں لیں اور کہنا شروع کیا۔

"بھائیو! میرا مشورہ ہے کہ آپ لوگ اس وقت اپنے گھروں میں جا کر سو رہیے اور مجھ کو بھی جانے دیجیے۔ اس وقت ملک و قوم کی اس سے بڑھ کر اور کوئی خدمت نہیں ہو سکتی۔"

سب نے یک زبان ہو کر چیخنا شروع کیا۔ "نہیں تقریر، نہیں تقریر۔"

میں نے پھر ہاتھ اُٹھا کر خاموش کیا اور کہنا شروع کیا۔

"آپ میرے مشورے پر عمل کیجیے ورنہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ میں قوم کی خدمت سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ اب آپ جائیے پھر کبھی تقریر ہوگی۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔"

یہ کہہ کر میں نہایت تیزی سے بھاگا۔ اور تمام مجمع میرے پیچھے دوڑا۔ میں نے اپنے گھر میں گھس کر زنجیر چڑھا دی۔ آخرکار سب لوگ لوٹ گئے۔ اُس روز رات بھر مجھ کو نیند نہ آئی۔ اور صبح یہ محسوس ہو رہا تھا کہ یہ بھی سودیشی ریل کی طرح کا کوئی خواب پریشان ہوگا لیکن میرے جسم پر کھدر کا لباس موجود تھا۔ لہذا یہ واقعات خواب نہیں ہو سکتے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ میں نے بیداری میں یہ خواب دیکھا ہو یا یہ واقعات سودیشی ریل کے خواب کی تعبیر تھے۔

نسیم انھونوی

آپ کا اسم گرامی محمد نسیم ہے، اور اگر عاشقی میں عزت سادات نہیں گئی ہے یعنی میر تقی میر کی طرح آپ بھی خوار ہوتے نہیں پھرے ہیں اور آپ کے ساتھ بھی یہ واقعہ پیش نہیں آیا ہے کہ آپ کو بھی کوئی نہ پوچھے تو آپ سید بھی ہیں۔ ضلع رائے بریلی کے قصبہ انھونہ کے رہنے والے ہیں۔ لہذا آپ کا مکمل نام سید محمد نسیم انھونوی ہے لیکن آپ اپنے کو یا تو انکسار سے یا دُنیا کو تخلص کے فریب میں مبتلا کرنے کے لیے صرف نسیم انھونوی لکھتے ہیں۔ حالانکہ خدا گواہ ہے کہ آپ اور چاہے جو کچھ بھی ہوں لیکن شاعر نہیں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ خود ہم نے ان حضرت کو ایک آدھ گھریلو مشاعرہ میں اپنی ذاتی غزل پڑھتے سُنا ہے۔ لیکن اسکے باوجود ہم کو کبھی یقین نہیں آیا کہ آپ شاعر بھی ہو سکتے

ہیں۔۔ وہ گئی وہ غزل جو ہم نے آپ کو پڑھتے سُنی ہے اُسکے متعلق یہ
کہا جا سکتا ہے کہ خدا جانے وہ کمبخت اپنی بدقسمتی سے نسیم انھونوی کا
نتیجہ، فکر کیونکر بن گئی۔ کاش کہ وہ کسی شاعر کی غزل ہوتی۔ مختصر یہ کہ
آپ صاحب دیوان تو نہیں البتہ صاحب اولاد ہیں اور چونکہ صاحب
اولاد ہیں لہذا ظاہر ہے کہ کسی اللہ کی بندی کے شوہر نامدار بھی ہونگے۔
بہر حال ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ نسیم انھونوی ایسے انسان کا صاحب اولاد
ہونا یا صاحب جائداد ہونا، کسی کا شوہر بن جانا یا کسی کو بیوی بنا لینا
سب یکساں ہے اور اُن کو ان مختلف باتوں میں کبھی کوئی فرق محسوس
نہیں ہو سکتا بلکہ اگر اُن سے پوچھا جائے کہ "آپ نے شادی کیوں کی"۔
تو وہ یقیناً یہی جواب دیں گے کہ "ہو گئی ہو گی، میں نے تو نہیں کی"
اور اسی طرح اولاد والے سوال کا جواب بھی ہو گا۔ ان جوابات میں
کسی قسم کا کوئی مزاح، کوئی تصنع یا کوئی غلط بیانی قطعاً نہیں ہے بلکہ
واقعہ یہی ہے کہ اُن سے متعلق جتنی دنیا کی باتیں ہوتی ہیں وہ عام طور
پر خود بخود ہو جایا کرتی ہیں۔ اُن میں خود نسیم صاحب کے ارادہ یا عمل کا
کوئی دخل نہیں ہوتا اور اگر عمل کو دخل ہوتا بھی ہے تو قطعاً غیر ارادی

طور پر۔ لیکن اس کے باوجود آپ اپنے متعلقہ کاموں میں انہماک اور محنت کے اعتبار سے اپنی قسم کے کولھو کے بیل واقع ہوئے ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اُن ایسے انسان کی بھی دنیا کو ضرورت ہے اور اُن کو بھی غیر ضروری نہیں کہا جا سکتا۔ خصوصیت کے ساتھ انکا وہ استقلال جس کو ہم اور ہماری قسم کے سیمابی ارادوں والے انسان جن کی فطرت ہی میں غیر مستقل مزاجی ہے جیسی کہتے ہیں یقیناً قابل داد ہے۔

نسیم صاحب کا بچپن اور وہ دور جس میں انسان اور غلمان میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ ہمارے لیے قطعاً تاریکی میں ہے اور ہم اُس پر کوئی روشنی اس لیے نہیں ڈال سکتے کہ نسیم صاحب سے اُس زمانہ میں شرف نیاز حاصل نہ تھا، ہم تو اُن کو اُس وقت سے جانتے ہیں جب "ہمدم" مرحوم کے جاہلی دور کے بعد ہم ایک رکن ادارت کی حیثیت سے دفتر روزنامہ ہمدم میں دن بھر بیٹھکر کام کرتے تھے اور نسیم صاحب لکھنوی رسالہ "انکشاف" کے مدیر کی حیثیت سے روزانہ ہمارے پاس صرف اس لیے آتے تھے کہ ہم انکشاف کے سالانہ نمبر کے لیے ایک افسانہ لکھدیں۔ ہم روز دوسرے دن کا وعدہ کرتے تھے، اور وہ ہر دوسرے دن ہم کو تازیانہ پہنچانے

کے لیے بلائے ناگہاں کی طرح نازل ہو جایا کرتے تھے وہ ہمارے
لیے یہ رائے قائم کر رہے تھے کہ ہم سخت جھوٹے ہیں اور ہم اُن کے
لیے یہ رائے قائم کر چکے تھے کہ انتہائی مستقل مزاج شخص ہے لیکن وہ
ہماری وعدہ خلافیوں کو شکست دینے کے درپے تھے اور ہم اُنکی
مستقل مزاجی کے مسلسل اور متواتر امتحان لے رہے تھے۔ خدا جانے
اس سلسلہ نے کہاں تک طول کھینچا۔ لیکن ہم کو تو اتنا یاد ہے کہ ہم
ہی کو شکست ہوئی تھی اور انکشاف کے سالانہ نمبر میں نہ صرف ہمارا
فسانہ شائع ہوا تھا بلکہ افسانہ بھی نظم بھی اور تصویر بھی مختصر یہ کہ
ہمارے اور اُن کے تعلقات کی ابتدا یہیں سے ہوئی تھی۔

شروع شروع میں تو ہم نے یہ رائے قائم کی تھی کہ بیچارہ نسیم
فدوی قسم کا انسان ہے اور بیچارہ "نسیم انھونوی" نہیں بلکہ "نسیم بھونڈی"
ہے اور واقعی ان کا جو فدویانہ اور خاکسارانہ طرزِ عمل ہمارے ساتھ
تھا، اس سے ہم اسی نتیجہ پر پہنچ سکتے تھے کہ ان بیچارے صاحب کا
عدم اور وجود سب برابر ہے، یہ تو بس سعادت آثار ہی سعادت آثار
ہیں، لیکن رفتہ رفتہ جب آپ کے تو عروسانہ حجاب نے بیحجابی کی صورت

اختیار کی اور آپ ذرا کھلے تو معلوم ہوا کہ آپ میں فدویت تو نہیں البتہ نسائی جھجک ضرور ہے، یہ خصوصیت ایسی نہ تھی جسکو ہم گنواروں کی طرح غیر محسوس طور پر نظر انداز کر دیتے۔ ہم نے اسکی دل سے قدر کی اور ہم کو اسکا افسوس بھی ہوا کہ یہ قیمتی صفات فطرت کی ذرا غلطی سے بجائے کسی کافرہ کو ملنے کے اس کافر کو مل گئے۔ اگر کہیں یہ لجایا ہوا تبسم، یہ شرمگیں نگاہیں، یہ دامن بچانے والی ادائیں، یہ آواز کا ترنم، یہ رفتار کی غزالیت، یہ پیروں سے اوپر تک والی طاؤسیت، یہ لچک، یہ چمک، یہ جھجک، یہ کسک، اور یہ مسک کسی عورت کو مل جاتی تو ہم سچ کہتے ہیں کہ وہ قیامت بن کر دنیا کو ہلا ڈالتی لیکن فطرت کی غلط بخشیوں نے ان عطایا کے لیے ایک مرد کا انتخاب کیا اور وہ بھی نسیم انھونوی ایسے مرد کا۔ پھر بھی ہم کو یہ دیکھکر مسرت ہوتی ہے کہ باوجود نسیم صاحب کے مرد ہونے کے ان خصوصیات سے قدردانوں کی تعداد کم نہیں ہے اور ایسے ایسے حسن شناسوں نے ان چیزوں کی تعریف کی ہے جن کی تعریف ہر حیثیت سے معتبر کہی جا سکتی ہے چنانچہ مجھ کو مولانا سیماب صدیقی اکبرآبادی کا یہ فقرہ کبھی نہیں بھول سکتا

کہ "نسیم کی چال میں کافی پامالیوں کے سامان موجود ہیں" یا جنابِ جمیل بلگرامی نے آپ کی سُرمگیں آنکھوں کی موہنی کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس سے چاہے دُنیا جتنی بھی بدگمان ہو لیکن میں تو یہی کہوں گا کہ اُنھوں نے بے اختیار ہو کر نسیم کے مُنہ پر نہ کہنے والی بات کہدی خیر، ان تمام باتوں کے متعلق تو نسیم صاحب یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ احباب کا مذاق ہے لیکن ان کے پاس اپنے والدین کے اس مستقل مذاق کا کیا علاج ہے جو اُنھوں نے آپ کا زنانہ نام رکھنے کے معاملہ میں کیا ہے! کیا اس سے بھی وہ مُکر جائینگے کہ اُن کا نام نسیم ہے؟ - اسکو جانے دیجیے لیکن خود اُن حضرت نے ایک زنانہ رسالہ "حریم" کے نام سے نکال کر اپنی نسائیت کا جو عملی ثبوت دیا ہے اسکا کیا علاج ہے؟ -

بہرحال اس میں شک نہیں کہ نسیم نے مرد ہو کر جو ظلم کیا ہے اسکے لیے ہم تو یقیناً خدا کے یہاں ان کے دامنگیر ہوں گے اس لیے نہیں کہ وہ حسین ہیں اور نہ اس لیے کہ ہم پر اُنکی جاذبیت کا کوئی اثر ہوا ہے بلکہ محض اس لیے کہ ہم کو اُن سے محبت ہے اور یہ محبت انتہائی مدارج طے کرنے کے بعد بھی دوست کی محبت رہتی ہے اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی

ہم پھر ایک مرتبہ اس بات کو صاف کر دینا چاہتے ہیں کہ ہماری محبت کا کوئی تعلق نسیم کی لطافت یا اُنکے نام کی نزاکت سے نہیں ہے بلکہ ہم کو تو وہ یوں ہی اچھے لگتے ہیں۔ اُنکی بھولی بھولی باتیں، اُنکی سادہ سادہ ادائیں، اُنکے دل اور زبان کی یکسانیت، اُنکی بچوں کی سی معصومیت، اُنکی سادہ لوحی، اُنکی سچائی، اُنکی دیانت داری، اُنکی "یک سخنی" والی افتادِ طبیعت اور اُنکی اسی قسم کی باتیں اُنکو حلقۂ احباب میں محبوب ترین رُکن بنا دینے کے لیے کافی ہیں۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ ہمارے یارانِ میکدہ میں یا بقول مولانا نیاز فتحپوری یارانِ نجد میں نسیم صاحب کو وہی درجہ حاصل ہے جو بارات میں دولھا کو، کانگریس کے اجلاس میں صدرِ منتخب کو، افیونیوں کی مجلس میں داستان گو کو، میخانہ میں پیرِ میخانہ کو، گورنر کے اجلاس کونسل میں گورنر کو، ریل گاڑی میں انجن کو، امین آباد پارک میں گھنٹہ گھر کو، آگرہ میں تاج محل کو، دہلی میں جامع مسجد کو، مہوبہ میں پان کو، لکھنؤ میں چکن اور جامدانی کو، ڈھاکہ میں ململ کو، لاہور میں پاٹڑہ کو، ملیح آباد میں سفیدہ اور دسہری آم کو، ہاتھرس میں سروتے کو، کشمیر میں آلوچے کو اور الٰہ آباد میں امرود کو حاصل ہے۔ ان سیکڑوں مثالوں کے بعد نسیم صاحب کی اہمیت پر مزید

روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے، صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ۔ ع

اُف یہ تیری انجمن آرائیاں

نسیم فطرتاً کچھ ایسے تیکھے واقع ہوئے ہیں کہ اُن سے دلچسپی لینے کو دل چاہتا ہے، ان کی معصوم باتیں بعض اوقات اس قدر پر لطف ہوتی ہیں کہ اُنکو چھیڑ چھیڑ کر لطف حاصل کرتے ہی ہیں، دلچسپیاں پیدا ہوتی ہیں مثلاً چھیڑ دیجیے کوئی مذہبی مسئلہ پھر دیکھیے کہ کیا چہکتے ہیں، اپنے نزدیک۔ ایسے ایسے دلائل سے بحث کرینگے کہ اگر اللہ میاں بھی اُن کو رد کرنا چاہیں تو آسانی کے ساتھ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ویسے تو وہ پھر اللہ میاں ہی ہیں۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ نہ خود قائل ہونگے نہ دوسرے کو قائل کرینگے۔ بس اُنکی صرف یہ کوشش ہوگی کہ بحث کسی طرح طویل ہو جائے اور یہ سلسلۂ لامتناہی بن کر کبھی ختم نہ ہو۔ اسی طرح بزنس کے معاملات پر جس وقت تبصرہ کرنے بیٹھیں گے تو معلوم ہوگا کہ تجارت کے وہ تمام اصول جن پر آج دنیا کے بڑے بڑے تجارتی ممالک عمل کر رہے ہیں دراصل آپ ہی کے مقرر کردہ ہیں اور آپ کو کسی قسم کا تجارتی مشورہ دینا گویا "لقمان را حکمت آموختن" کے برابر ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ

ساتھ آپ میں تحقیق اور تفتیش کا ایک خاص مادہ ہے کیا مجال جو کوئی ایسی چیز آپ کی نظر کے سامنے سے گزر جائے جسکو آپ نہیں جانتے ہیں اور آپ اسکو جاننے کی کوشش نہ کریں۔ اُسی وقت ضروری سے ضروری کام کو چھوڑ کر تحقیقات شروع کر دینگے اور جب تک خوب اچھی طرح سمجھ نہ لینگے اُس وقت تک اپنی تحقیقات کو ختم نہ کرینگے۔ مثلاً ابھی کل کی بات ہے کہ مطبع میں کھڑے ہوے مشین میں برقی موٹر لگا رہے تھے کہ مشین مین نے بریک لگا کر مشین کو بند کر دیا۔ بس اب آپ کو یہ فکر ہوئی کہ یہ کہاں سے چل کر کس راستہ سے کہاں گیا ہے اور کس طرح مشین کو بند کر دیتا ہے۔ مشین مین نے آپ کو خوب اچھی طرح تشریح کے ساتھ سمجھایا اور جب آپ سمجھ گئے تو نہایت اطمینان کے ساتھ کہنے لگے "یہ لوگ بھی کیا کیا ترکیبیں لڑاتے ہیں۔ مولانا نیاز کو اور مجھ کو ان کے اس بیساختہ جملہ پر ہنسی آگئی اور مولانا نیاز نے فرمایا "دیکھیے یہ ہے فرق اہل زبان اور غیر اہل زبان کا کہ ترکیبیں لڑانا کوئی غیر اہل زبان نہیں بول سکتا تھا۔" اب یہاں سے زبان کا مسئلہ چھڑ گیا، آپ نے سنجیدگی سے مسکرا کر فرمایا "واقعی غیر اہل زبان کیا خاک سمجھے گا کہ ترکیبیں کس طرح لڑائی جاتی

ہیں۔" اسی طرح ایک مرتبہ سرکہ کے متعلق بحث ہو گئی، بات یہ تھی کہ نسیم صاحب کو سرکہ سے پیدائشی نفرت ہے۔ آج تک کبھی چکھا تک نہیں ہے، اور نفرت اس حد کو پہونچ چکی ہے کہ اگر کوئی مولوی اپنے وعظ میں بیان کر دے کہ جنت میں ایک سرکہ کی بھی نہر ہوگی تو شاید نسیم صاحب جنت کا خیال بھی دل سے نکال دیں، ہاں تو وہ بحث اس لیے شروع ہوئی کہ آپ کو شہد بھی مرغوب نہیں ہے اور وصل صاحب بلگرامی اپنے پہاڑ سے منگائے ہوئے شہد خالص کی داد چاہتے تھے کہ اس راز کا انکشاف ہو گیا۔ اب کیا تھا دونوں اپنی اپنی جگہ پر زبردست مناظرہ کرنے لگے۔ البتہ کمبختی ان لوگوں کی تھی جو سامع کی حیثیت سے وہاں موجود تھے، خدا کی پناہ نوبت یہاں تک پہونچی کہ آخر میں کانوں نے سننا اور دماغ نے سمجھنا چھوڑ دیا۔ ان دونوں میں سرگرم بحث ہو رہی تھی لیکن ہمارے کانوں میں سوائے جیں جیں اور چخ چخ کے کوئی آواز نہ آتی تھی اور خدا جانے کہ آخر میں کون جیتا۔ بہرحال ہم نے آخر میں یہ دیکھا کہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر پھولے بیٹھے ہیں اور دونوں کا دل ایک دوسرے کی طرف سے صاف نہیں ہے۔

یہ سب جھگڑا دراصل سرکہ کا پیدا کیا ہوا تھا۔ اور اس جھگڑے کے علاوہ ہم کو

یقین ہے کہ نسیم صاحب سے ہر وقت سرکہ کو بحث میں لاکر لڑائی مول لیجا سکتی ہے، پہلے تو وہ دلائل سے سرکہ کی غلاظت کو ثابت کرینگے لیکن جس وقت اُن سے یہ کہا جائیگا کہ پیغمبر اسلام صلعم نے بھی سرکہ کی بے حد تعریف فرمائی ہے لہذا کم سے کم تم اس کو بُرا نہ کہو، اس وقت سرکہ کی بحث مذہبی بحث بن جائیگی اور اب نسیم صاحب اپنے عقائد کے اعتبار سے جن میں انگریزی قسم کی شریعت اور نئی روشنی کی مذہبیت کو زیادہ دخل ہوتا ہے اور بوقت ضرورت بہت ہی دقیانوسی قسم کی شریعت کو بھی اپنا عقیدہ بنا لیا جاتا ہے بحث شروع کرینگے اور بحث کو کچھ ایسا اُلجھا دیں گے کہ وہ سرکہ سے شروع ہو کر نہیں معلوم کہاں کہاں ہوتی ہوئی ابن سعود تک پہونچے گی اور آخر میں جاکر خود اُن کو بھی یاد نہ رہیگا کہ یہ بحث دراصل شروع ہوئی تھی سرکہ سے اور بات میں بات پیدا ہو کر کہاں سے کہاں پہونچی اور اگر اتفاق سے بحث کے بعد یاد آگیا یا کسی نے یاد کرا دیا تو اس تضیع اوقات پر ہنسکر اور تالی بجاکر افسوس فرمائیں گے کہ "لاحول ولا قوت بات کیا تھی اور ہو گئی کیا، مگر اب وقت بہت ہو گیا ہے السلام علیکم"۔

البتہ شکر خوری کے معاملہ میں تو آپ کا جواب ہی نہیں ہے بس اس کو حد سمجھیے کہ اگر آپ کو زندگی بھر شکر، گڑ، راب، مٹھائیاں، اور دوسری میٹھی چیزوں کے علاوہ نمک قطعاً نہ دیا جائے تو بھی شاید مٹھائی سے ان کا دل نہ بھرے۔ حال یہ ہے کہ مٹھائی کا نام آجائے پھر دیکھیے کہ نسیم صاحب کے منھ کے اندر ہی اندر کیسے کیسے قوام تیار ہوتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ بس رال ٹپک ہی پڑے گی، بازار میں چلے جا رہے ہیں کہ چلتے چلتے ایک جگہ پر ٹھہر گئے، ہم لوگ تو انکے ساتھ رہتے رہتے اس موٹر قبل ہوجانے کا مفہوم سمجھ چکے ہیں، کبھی اُن سے ٹھہرنے کی وجہ نہیں پوچھتے بلکہ اُن سے پوچھنے سے پہلے خود ہی چاروں طرف دیکھ لیتے ہیں کہ حلوائی کی دوکان کدھر ہے، اسکے بعد اُن سے پوچھتے ہیں کہ "خیریت تو ہے؟" اور اسکا جواب وہ ہمیشہ یہی دیتے ہیں کہ "دیکھو تو کیا تازہ تازہ حلوہ سوہن رکھا ہوا ہے اور کس قدر عمدہ امرتیاں ہیں" یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ ہر مرتبہ وہ مٹھائی خریدنے کے لیے کھڑے ہو جائیں، بلکہ بعض اوقات تو وہ محض اس لیے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ مٹھائی کی دوکان کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے انسان پیدا ہونے اور

مکھی یا چیونٹا نہ بننے پر غور کریں اگر کہیں خداوند کریم اُن کو بجائے نسیم انھونوی کے "مگس تھال حلوائی" یا "زنبور خوانچۂ شیرینی فروش" یا کم سے کم شیرے کے مٹکے پر لپٹی ہوئی چیونٹی بنا دیتا تو وہ اسکے سوا پھر اور کچھ نہ مانگتے اور اُسی زندگی کو ہی جنت سمجھتے لیکن اب تو وہ باوجود دن رات مٹھائی کھانے کے مٹھائی کے لیے صرف اس امید پر ترس رہے ہیں کہ جنت میں جاتے ہی لنگوٹ باندھ کر جو شیرے کی نہر میں غوطہ لگائینگے تو پھر اُس نہر کے دریائی جانور ہو کر رہ جائیں گے، اور کبھی باہر نہ نکلینگے۔ یعنی یہ شکر خوری کی انتہا تو ملاحظہ فرمائیے کہ اگر کسی وقت اتفاق سے کھانے میں کوئی میٹھی چیز نہ ہو تو حلق تک پیٹ بھر لینے کے بعد بھی آپ گویا بھوکے رہ جائیں گے اور آپ کو یہی معلوم ہو گا کہ گویا کھانا نہیں کھایا ہے۔ جن احباب کو آپ کی اس مکھیوں والی بھنبھناہٹ کا علم ہے، وہ تو خیر دعوت وغیرہ کے موقع پر آپ کے لیے میٹھے قورمہ تک کا انتظام کر دیتے ہیں، لیکن جو اب تک لاعلم ہیں اُن کے یہاں دعوت میں شریک ہو کر اور ماحضر تناول فرما کر بھی آپ ہمیشہ یہی کہتے ہوئے گھر واپس ہوتے ہیں کہ سہ

اے ذوق شکر خوری تجھ تکلیف سراسر   آرام سے وہ ہیں جو شکر ہی نہیں کھاتے

اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرکہ سے آپ کو نفرت ہے اور مٹھائی سے عشق لیکن اگر مٹھائی میں سرکہ یا سرکہ میں مٹھائی ملا دی جائے تو آپ کیا کرینگے؟ سوال تو بہت ٹیڑھا ہے لیکن جہاں تک ہمارا خیال ہے آپ کی سرکہ سے نفرت مٹھائی سے عشق پر غالب آ جائیگی اور آپ سرکہ آمیز مٹھائی کو بھی نہ چھوئیں گے لیکن آپ کو افسوس ضرور ہوگا کہ کاش یہ مٹھائی سرکہ کی آمیزش سے ہمارے لیے ناقابل استعمال بنائی جاتی اور ہم اسکو کھا سکتے۔

نسیم صاحب کی مرغوب ترین چیز تو ہر وہ چیز ہے جس میں شکر ہو لیکن سرکہ نہ ہو مگر نفرت بہت سی چیزوں سے ہے مثلاً پرندوں کا گوشت، ہر قسم کا شکار، اور مچھلی وغیرہ، گویا یہ جو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی چھری نے اُچھل کر آسمان پرٹڈی کو اور دریا میں مچھلی کو حلال کیا تھا یہ سب آپ کے نزدیک بیکار تھا، مچھلی آپ کے لیے بدستور حرام رہی اور ٹڈی کو بھی آپ کھانے کی چیز نہیں بلکہ فصل خراب کرنے کی آسمانی آفت سمجھتے ہیں، اب رہی مرغی اور مرغ، بٹیرا، تیتر، کبوتر اور چڑیا وغیرہ، ان کو

آپ اس لیے استعمال نہیں کرتے کہ آپ ایک سرے سے انکو ذبح کرنے ہی کے مخالف ہیں اور ان ہی کو ذبح کرنا کیا معنی آپ تو اس قسم کے مجاہد واقع ہوے ہیں کہ بقر عید کی قربانی سے لیکر تقریب ختنہ تک کے انتہائی مخالف ہیں اور اسکی وجہ صرف آپ کی وہ رحم دلی ہے جو اپنی انتہا کو پہونچ کر بزدلی ہو جاتی ہے یعنی حال یہ ہے کہ آپ کے سامنے مرغی تک نہیں ذبح کی جا سکتی۔ بکری تو پھر بکری ہے اور ذبح کرنا تو پھر بھی موت اور زندگی کا معاملہ ہے ختنہ میں تو اسکا کوئی ڈر نہیں ہوتا۔ لیکن آپ اپنی نظروں سے کسی کو خون بہا کر مسلمان ہوتا ہوا بھی نہیں دیکھ سکتے۔ واہ رے میرے بہادر۔ ع

اے میں صدقہ لڑن میں جاؤ گے اسی انداز سے

رہ گئی آپ کی ادبیت اس کا یہ حال ہے کہ رات کو دس بجے سے لیکر ایک بجے رات تک بلا ناغہ روزانہ ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ اُٹھایا قلم اور گھسیٹا کاغذ، بس پھر کیا تھا ایک ہی نشست میں لکھ ڈالا آٹھ دس صفحہ کا ایک افسانہ اور سو گئے صبح تڑکے یعنی چھ بجے کے قریب بیدار ہو گئے۔ یہ جوانی کی راتیں دیکھیے اور پانچ چھ گھنٹے سونا دیکھیے۔

یہ منگوں کے دن دیکھیے اور بائیسکل پر ورنہ پیدل اپنے دفتر سے پریس اور پریس سے بلاک سازی کے کارخانے اور وہاں سے یہاں کی خاک چھانتا ملاحظہ فرمائیے، خدا ان کو اس محنت کا پھل دیگا یا نہیں یہ تو دوسرا سوال ہے لیکن رونا تو اس پر آتا ہے کہ یہ جوانی یوں ہی گزر رہی ہے اور اس بندۂ خدا کو ذرا بھی احساس نہیں اور اگر ہم کچھ کہیں بھی تو وہ یہی جواب دینگے کہ "تو کیا آپ کی طرح آرام طلب ہو جاؤں"۔

بہت سے احباب کو یہ شوق ہے کہ نسیم صاحب کی زندگی کے اس پہلو کو بھی دیکھا جائے جسکا نام ہے تخلیہ اور جہاں صرف ایک مرد اور عورت اس لیے ہوتے ہیں کہ دونوں میں سے جو پرستار ہو وہ پرستش کرے اور جو قابل پرستش ہو وہ دیوتا بنا بیٹھا رہے۔ عام طور پر تو یہ ہوتا ہے کہ مرد ہی کو پجاری بننا پڑتا ہے اور عورت کی فطرت میں معبودیت ہے، لیکن نسیم صاحب کے متعلق ہماری یہ رائے ہے کہ ان کے یہاں تخلیہ میں سوائے اس کے کچھ نہ ہوتا ہوگا کہ یہ ادھر اکڑے بیٹھے ہیں اور وہ اُدھر اکڑی بیٹھی ہیں یہ کہتے ہیں کہ ہم مجازی خدا ہیں اور وہ کہتی ہیں کہ میں بُتِ ساز ہوں۔ یہ کہتے ہیں میری پرستش کرو وہ کہتی ہیں

میری پرستش کرو، یہ کہتے ہونگے بڑی خوبصورت بنتی ہیں وہ کہتی ہونگی "پہلے اپنی صورت تو دیکھو" مختصر یہ کہ اُدھر نازِ حُسن ہوگا تو ادھر بھی آپ کی دعا سے پندارِ عشق نہیں بلکہ پندارِ حُسن ہی ہوگا۔ لیکن سُنا ہے کہ نسیم صاحب کے صاحبزادے کی والدہ ماجدہ اپنی قسم کی اللہ میاں کی گائے واقع ہوئی ہیں اور وہ بھی مرکھنی نہیں لہٰذا ممکن ہے کہ یہ دو طرفہ اکڑفوں نہ ہوتی ہو، لیکن جن لوگوں کو یہ شوق ہے کہ نسیم صاحب کی زندگی کے اس رُخ کو بھی دیکھیں وہ تو صرف اس لیے ہے کہ باہر تو وہ عورت ذات کو دیکھکر ایسا شرماتے ہیں گویا اگر تنہائی میں کوئی عورت اُن کو مل جائے تو شاید یہ حضرت زندہ نہیں رہ سکتے، لہٰذا یہی تو دیکھنا ہے کہ "چوں بخلوت می روند" اُس وقت کیا ہوتا ہوگا لیکن شرط یہی ہے کہ خلوت میں بجائے عورت کے کھونٹے سے بندھی ہوئی گائے مع بچھڑے کے نہ ہو بلکہ صحیح معنوں میں عورت ہو۔ بہرحال ہماری رائے میں نسیم انھونوی اپنی قسم کے پہلے اور آخری انسان ہیں اور ہم کو تعجب ہے کہ وہ اِس دور میں کیوں پیدا ہوئے، جب کہ اُنکو دیوانہ بریلوی، کی طرح کے تمام احباب بالکل انھونوی قسم کا انسان سمجھتے ہیں

کچھ بھی ہو، لیکن ہم تو یہی کہیں گے کہ اے نسیمؔ افغونوی ؎

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

معاف کیجیے گا

معاف کیجیے گا
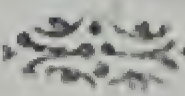
جس طرح ہر مرض کی دوا "درود شریف" ہے، بالکل اسی طرح "معاف کیجیے گا" بھی عجیب پُر تاثیر عمل ہے کہ کسی کے منہ پر تھوک دیجیے، کسی کو اُٹھا کر پٹک دیجیے، کسی کے ٹیپ جھاڑ دیجیے، کسی کو گالی دیجیے، کسی کے بید رسید کر دیجیے، کسی کو بائیسکل سے گرا دیجیے، کسی کا کوئی شدید سے شدید نقصان کر دیجیے، لیکن جہاں آپ نے اُس سے "معاف کیجیے گا" کہا اگر وہ شریف ہے تو فوراً یہی کہیگا کہ "کوئی ہرج نہیں"، اور اگر یہ نہ کہے تو سمجھ لیجیے کہ اس شخص میں شرافت کا قطعاً اثر نہیں ہے اور یہ سمجھنے کے بعد آپ کو پورا اختیار ہے کہ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے زریں اصول کو پیش نظر رکھ کے جتنا جی چاہے اُسکو برا بھلا کہیے ایک آدھ بات کا تو وہ بھی سختی سے جواب دیگا لیکن بعد میں

جب چاروں طرف جمع ہو جانے والے راہگیر فیصلہ کرینگے تو وہ آپ ہی کے موافق
ہوگا۔ کہ سب اُسی کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دینگے کہ وہ بیچارے تو اتفاقی غلطی پر
"معاف کیجیے گا" کہہ رہے ہیں اور تو اکڑا ہی جاتا ہے۔ پھر آپ سے سب کہیں گے کہ
جائیے صاحب جائیے اسکو بکنے دیجیے۔ یہ گویا آپکی فتح ہوگی اور آپ مونچھوں پر تاؤ
دیتے ہوئے مجمع سے نکلکر اپنا راستہ لیں گے۔ آپکی اس فتح کا راز دراصل یہی "معاف
کیجیے گا" والا عمل ہے۔ یہ تو ایک معمولی سی جھڑپ کی مثال پیش کی گئی ہے
ورنہ یہ عمل تو ایسے ایسے معرکوں میں کام آتا ہے جہاں آپ تو آپ آپکے فرشتے
بھی بغلیں جھانکنے لگیں، یہ تو ایک معمولی سی بات ہے کہ کسی سفید پوش شریف
مرد آدمی کو پیچھے سے جاکر ایک گھونسہ گھم سے رسید کیا اور جب اس بیچارے
نے گھوم کر دیکھا تو آپ نے فوراً کہا "معاف کیجیے گا"۔ میں سمجھا تھا کہ مرزا ہیں
اور آپ پیچھے سے بالکل "مرزا" معلوم ہوتے ہیں "معاف کیجیے گا"۔ یہ سُن کر
وہ بیچارہ سوائے اسکے اور کیا کرسکتا ہے کہ اپنی پیٹھ سہلائے اور مسکرائے اور آپ سے
کہدے کہ "کوئی ہرج نہیں، جناب کوئی ہرج نہیں"۔ یہ "کوئی ہرج نہیں"
ایسے ایسے موقعوں پر کہا جاتا ہے جہاں سوائے فوجداری کے اور کوئی بات ہی
نہ ہو سکے یعنی آپ نے پان کی پچکاری دہانِ مبارک سے اس طرح چھوڑی ہے کہ کسی

بیچارے کی قیمتی شیروانی پر پڑی آپ تو خیر میاں ختگی ہیں یا گھبرا کر "معاف کیجئے گا" کہہ دینگے لیکن وہ حضرت بھی دامن جھٹک کر کوئی ہرج نہیں اسطرح کہینگے گویا کچھ ہوا ہی نہیں حالانکہ اگر آپ نے "معاف کیجئے گا" دالاعمل نہ پڑھا ہوتا تو خدا نخواستہ سڑک ہی پر کشتی کے ایسے داؤں پیچ دیکھنے میں آتے جنکے لیے عظیم الشان دنگل منعقد کئے جاتے ہیں اور اسکے علاوہ آپ کے کپڑوں کی وہ درگت بنتی کہ شاید "لندن واشنگ کمپنی" بھی اُن اغلاے "گردم پٹھنا" کو صاف نہ کر سکتی، معمولی دھوبیوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ یا اگر وہ اُن کو صاف کر لینے کی قسم ہی کھا لیتی تو اُن زخموں کا علاج شاید مدتوں ہوتا جو گھٹنوں پر اور کہنیوں پر اس معرکہ میں آ جاتے ہیں۔۔ اب ہی عزت آبروئے اسکا ہم ذکر ہی نہیں کرتے اس لیے کہ وہ شریف آدمیوں میں اس طرح آ جاتی ہے جیسے جائداد غیر منقولہ ایسی ایسی معمولی باتوں سے رہ جایا نہیں کرتی یہ ایک معمولی سی لڑائی ہے۔ ہم نے تو اس "معاف کیجئے گا" کی تاثیر ایسے موقعوں پر بھی دیکھی ہیں جہاں اچھے خاصے بلوہ کا اندیشہ ہو جسکے لیے دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ حفظ ماتقدم کے طور پر ہوتا ہے یعنی لاکھوں آدمیوں کے مجمع میں ایک مقرر جب تقریر کرتے کرتے حاضرین کو گالیاں دینا چاہتا ہے تو وہ یہی کہتا ہے کہ "معاف کیجئے گا" آپ حضرات

بڑے نامعقول ہیں - اور معاف کیجیے گا آپ لوگ بالکل بیوقوف ہیں - اور
معاف کیجیے گا آپ لوگ عورتوں سے بھی بدتر ہیں - اور معاف کیجیے گا آپ
لوگ جانوروں کے برابر ہیں - غرضیکہ معاف کیجیے گا کہہ کر اُسکا جو جی چاہتا
ہے کہتا ہے، اور سننے والے اس طرح سُنتے ہیں گویا کسی اور کو کہا جا رہا ہے،
اس میں درحقیقت انکی بے حمیتی نہیں ہے بلکہ یہ "معاف کیجیے گا" کا سحر
ہے جس سے تمام مجمع مسحور ہو جاتا ہے اور ان ہی گالیوں کو بکشادہ پیشانی
سنتا ہے، جن کو اگر "معاف کیجیے گا" کے بغیر کہا جاتا تو شاید حاضرین اپنے اس
مقرر صاحب کی جان ایک کر دیتے - اس "معاف کیجیے گا" کا رواج زیادہ تر
مہذب سوسائیٹیوں میں زیادہ ہے اس لیے کہ وہاں کے لوگوں کو اسکے جواب
میں "کوئی ہرج نہیں" کہنا آتا ہے، ورنہ جاہلوں سے تو اگر "معاف کیجیے گا"
کہا جائے تو وہ یہی جواب دینگے کہ "ایک تو مارا اُس پر کہتا ہے معاف کیجیے گا"
لیکن مہذب لوگوں میں اسکا اندیشہ نہیں - انگریزی داں طبقوں میں یہی "معاف
کیجیے گا" عام طور پر I am Sorry کے نام سے مشہور ہے، اور "کوئی ہرج
نہیں" وہ لوگ No matter کہتے ہیں - ہر روز بڑے سے بڑا
ہنگامہ اسی سوال و جواب پر ختم ہو جاتا ہے -
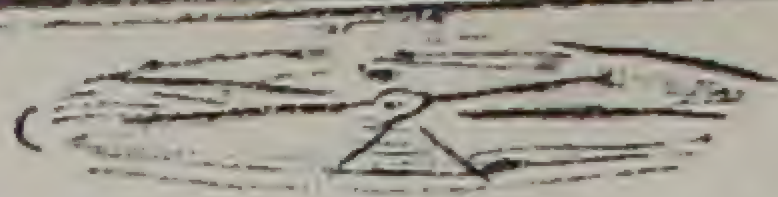
بیکاری

بیکاری

بیکاری یعنی بے روزگاری اس اعتبار سے تو نہایت لاجواب چیز ہے
کہ ہر چھوٹی سی چھوٹی حیثیت کا انسان اپنے گھر میں تمام دنیا سے بے نیاز ہوکر
اس طرح رہتا ہے کہ ایک شہنشاہ ہفت اقلیم کو اپنے محل میں وہ فارغ البالی
نصیب نہیں ہو سکتی ۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ دولت جس کو تمام دنیا کے سرمایہ دار
اپنی جان اور اپنا ایمان سمجھتے ہیں ایک ایسا مستقل عذاب ہے جو انسان کو
کبھی مطمئن نہیں ہونے دیتا ۔ سرمایہ داروں کی تمام زندگی بس دو ہی فکروں
میں کٹتی ہے ۔ ایک یہ کہ کس طرح تمام دنیا کا روپیہ ہمارے خزانہ میں آجائے ۔
دوسرے یہ کہ اگر ہمارا روپیہ چور لے گئے تو کیا ہوگا ؟ یہ دونوں فکریں
اپنی اپنی جگہ ایسی مہلک ہوتی ہیں کہ انکو بھی دق کی منجملہ دیگر اقسام کے
سمجھنا چاہیئے ۔ بلکہ دق کی دوسری قسمیں تو معمولی ہیں مثلاً پھیپھڑے کی

دق، آنتوں کی دق، ہڈی کی دق، وغیرہ مگر یہ فکریں دل اور دماغ کی دق سے کم نہیں جنکا مارا ہوا نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے بس توند بڑھتی جاتی ہے اور دل چھوٹا ہوتا رہتا ہے۔ مختصر یہ کہ ان سرمایہ داروں کی زندگی حقیقتاً کشمکش جبر و اختیار میں بسر ہوتی ہے کہ نہ زندہ رہتے بن پڑتی ہے نہ مرنے کو دل چاہتا ہے اب رہے غریب انکی زندگی بھی کوئی زندگی ہے کہ بلا ضرورت پیدا ہو گئے۔ اور جب جی چاہا مر گئے۔ نہ جینے کی خوشی تھی نہ مرنے کا کوئی غم۔

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

مطلب کہنے کا یہ کہ چاہے ہم کو بے روزگاروں کی جماعت گالیاں دے یا سرمایہ داروں کا طبقہ انعام، لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ موجودہ دنیا کے لیے بیکاری ایک رحمت ہے۔ حالانکہ اس رحمت سے ہندستان کے علاوہ تمام دنیا کے ممالک چیخ اُٹھے ہیں اور ہر طرف سے "ہائے پیٹ ہائے پیٹ" کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں لیکن ہم سچ کہتے ہیں کہ "ہائے پیٹ" کی صدائیں "پیٹ پھٹا" کی صداؤں کے مقابلہ میں پھر بھی قابل برداشت ہیں۔ لوگ کہیں گے کہ عجیب اُلٹی سمجھ کا آدمی ہے کہ تر لقمے پر فاقے کو ترجیح دیتا ہے لیکن جناب ہم اس حقیقت سے آشنا ہو چکے ہیں

کہ فاقہ اُسی وقت تک فاقہ ہے جب تک ترقیّے کی اُمید انسان کے پیٹ کو جہنم اور معدے کو ربڑ کا بنائے ہوئے ہے لیکن اگر انسان ترقیّے سے خالی الذہن ہو جائے تو یہی فاقہ اُسکے لیے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مرزا غالب مرحوم نے بھی اپنے ایک شعر میں اسی قسم کی ایک بات کہی ہے جس کا ترجمہ ہمارے الفاظ میں یہ ہوا کہ ؎

فاقہ کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتی ہے بھوک
اس قدر فاقے پڑے ہم پر کہ لقمہ بن گئے

ہم جو بات کہہ رہے ہیں وہ معمولی سمجھ کے انسانوں کے لیے بیکار ہے لہٰذا اسکا کہنا بھی فضول سی بات ہے اور نہ اس وقت ہم اس قسم کی بلند باتیں کرنا چاہتے ہیں، ہم تو اس وقت بیکاری کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں جس کے خلاف تمام دُنیا میں احتجاج کا ایک شور مچا ہوا ہے بیکاری اچھی چیز ہے یا بُری، اسکے متعلق ہم اپنے ذاتی خیال کو اگر تفصیل کے ساتھ پیش کریں تو ہم کو اندیشہ ہے کہ یا تو ہماری جان خطرے میں پڑ جائیگی ورنہ یہ تمام دنیا کی تجارت، کاروبار، اور ملازمتیں وغیرہ سب مفلوج ہو کر رہ جائینگی۔ لہٰذا دونوں صورتیں ایسی ہیں کہ ذرا ڈر معلوم ہوتا

ہے۔ معلوم نہیں اونٹ کس کروٹ بیٹھے - اس لیے بہترین صورت یہی ہے کہ عام نقطۂ نظر سے ہم بھی بیکاری کو بُرا فرض کرنے کے بعد اپنے "خامہ" سے "چل بسم اللہ" کہیں۔

بات اصل میں یہ ہے کہ نئی اور پُرانی دنیا ملا کر جو کرۂ ارض بنتا ہے اس میں تین چوتھائی تو "بحر الکاہل" "بحر الغافل" "بحر الجاہل" وغیرہ کی قسم کے بڑے بڑے سمندر ہیں یعنی پانی ہی پانی اب رہ گئی، ایک یہ چوتھائی دُنیا جو خدا نظر بد سے بچائے خشکی ہے - اس ایک چوتھائی دُنیا میں لق و دق صحرا، سربفلک پہاڑ، ریگستان جن کو انسان سے کوئی تعلق نہیں، بس "شترستان" کہنا چاہیے - اور جھیلیں، دریا، نالے وغیرہ ہیں باقی جو بچی تھوڑی سی خشکی اس میں کھیت اور باغ وغیرہ ہے بچی ہوئی خشکی کو گاؤں، تحصیل، پرگنہ، شہر، ضلع، صوبہ، ملک اور براعظم وغیرہ میں تقسیم کر دیا گیا ہے - اور یہ ہے وہ مختصر سی گنجائش جس میں جناب اشرف المخلوقات مع چرندوں پرندوں، درندوں کے رہتے ہیں - اس محدود گنجائش میں آبادی کا یہ حال ہے کہ خدا کی پناہ روز بروز بڑھتی جاتی ہے، دُنیا کی وسعتیں محدود ہیں اور نسل انسانی کی ترقی غیر محدود - اب جو لوگ

بیکاری کا رونا روتے ہیں تو آپ ہی بتائیے کہ یہ دُنیا کا قصور ہے یا دُنیا کے بسنے والوں کا۔ ہاں اگر نظامِ فطرت یہ ہوتا کہ ہر انسان کے ساتھ ساتھ ایک آدھ بیگہہ زمین بھی پیدا ہوا کرتی تو واقعی بیکاری کے متعلق ہماری تمام شکایتیں حق بجانب تھیں مگر اب تو ہر نیا پیدا ہونے والا اس چھوٹی سی دنیا میں گنجائش حاصل کرنا چاہتا ہے جو باوا آدم کے وقت سے لیکر اب تک یعنی از آدم تا ایں دم ایک انچ بھی نہیں بڑھی۔ آپ کہیں گے واہ بڑھی کیوں نہیں۔ یہ جو کولمبس نے امریکہ کا پتہ لگا کر اس دُنیا میں ایک ذرا اضافہ کیا وہ کدھر گیا، تو اسکا جواب یہ ہے کہ وہ پہلے سے موجود تھا، جب تک انسان کی جستجو میں کامیاب ہونے کی صلاحیت پیدا نہ ہوئی وہ پوشیدہ رہا۔ اور جب اس کو ڈھونڈھا گیا تو وہ مل گیا، لیکن اب یہ اُمید رکھنا کہ کوئی اور امریکہ مل جائے گا۔ غلط ہے اس لیے کہ انسان کو بیکاری کے غم نے یا تو اس قدر پست ہمت کر دیا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالنے میں بھی کاہلی سے کام لیتا ہے۔ یا سرمایہ داری نے ایسا دماغ خراب کر دیا ہے کہ مریخ پر سلطنت کرنے کی فکر ہے۔ ممکن ہے کہ کبھی یہ ہوا میں قلعہ بنانے کی جدوجہد کامیاب

ہو جائے ۔ لیکن ابھی تو ہم دُنیا سے جا کر مریخ میں آباد ہونے کے لیے تیار نہیں
لاحول ولا قوۃ کہاں سے کہاں پہونچے ۔ ہاں تو ہم یہ کہہ رہے
تھے کہ انسانوں کی کثرت نے دُنیا میں بیکاری کی وبا پھیلادی ہے ۔
بات یہ ہے کہ بڈھے تو مرنے کا نام نہیں لیتے اور بچے پیدا ہونا بند نہیں
کرتے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آبادی بڑھتی جاتی ہے ۔ اب یہ دیکھیے کہ جہاں
پانچ بچے پہلے تعلیم حاصل کرتے تھے ۔ وہاں اب پانچ ہزار تعلیم حاصل کرتے
ہیں ۔ پہلے تو یہ تھا کہ یہ پانچ بچے پڑھنے کے بعد پانچ جگہوں پر ملازم
ہو جاتے تھے ۔ ملازمت کرتے تھے پنشن لیتے تھے، اور مر جاتے تھے
لیکن اب یہ حال ہے کہ ملازمتیں تو وہی پانچ ہیں لیکن اُنکے امیدوار
بجائے پانچ کے پانچ ہزار ہیں ۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ پانچ تو بدستور
سابق برسر کار ہو جائینگے، اب رہے چار ہزار نو سو پچانوے وہ یقینی طور
پر بیکار رہیں گے ۔ یہ غلطی دراصل حساب کی غلطی ہے کہ اب آمد و خرچ
برابر نہیں رہا ۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ ادھر پانچ بچے پیدا ہوئے تو اُدھر پانچ
بڈھے مر گئے ۔ اُدھر پانچ امیدوار ملازم ہوئے تو اُدھر پانچ ملازموں نے
پنشن لے لی، لیکن اب بڈھوں نے مرنا ترک کر دیا ہے اور بچے برابر

پیدا ہوتے چلے جارہے ہیں اس صورت میں کوئی بڑے سے بڑا ریاضی داں ہم کو بتائے کہ حساب فہمی کا آخر کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔

اب یہ دیکھیے کہ پانچ ہزار میں سے پانچ کے برسر روزگار ہو جانے کے بعد جو باقی بچے تھے چار ہزار نو سو پچانوے۔ وہ گویا سب کے سب بیکار ہوئے ان بیچاروں کا یہ حال ہے کہ خدا دشمن کا بھی نہ کرے، ہائے وہ طالبعلمی کی اُمیدیں کہ بس پاس ہوئے اور ڈپٹی کلکٹری اپنے گھر کی لونڈی ہے۔ فارغ التحصیل ہوئے اور آنریبل بنے اگر گورنر نہیں تو ان کے باجلاس کونسل تو ضرور ہی ہو جائیں گے لیکن جب پڑھنے کے بعد درخواستیں بھیجنا شروع کیں تو ہر جگہ سے نامنظور ہو کر واپسی ڈاک گھر آ گئیں اب بتائیے کہ اس وقت وہ بیچارے کیا کریں۔ کوئی تو گھبرا کر قانون کا مطالعہ شروع کر دیتا ہے کوئی تجارت کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ کوئی ڈپٹی کلکٹری سے نا امید ہو کر ریلوے میں ٹکٹ کلکٹری کر لیتا ہے۔ کوئی بجائے آنریبل ہونے کے کلرکل لائن میں نکل جاتا ہے اور زیادہ تعداد اُن لوگوں کی ہوتی ہے جو بس ارادہ کرتے اور بدلتے ہیں، تجاویز پہ غور کرتے اور رہ جاتے ہیں۔۔ اسکیمیں بناتے ہیں اور رد کرتے ہیں۔ یعنی

بس گھر پر بیٹھے ہوئے بچوں کو کھلاتے ہیں اور مزے کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو عام طور پر بیکار۔ بے روزگار کہا جاتا ہے۔ اور آج کل دنیا ان ہی لوگوں سے بھری پڑی ہے۔

نصیحت کرنے والے جو اتفاق سے بے روزگاری کے آلام و مصائب سے قطعاً ناآشنا ہوتے ہیں۔ ہمیشہ یہی کہا کرتے ہیں کہ آج کل کے نوجوانوں میں آرام طلبی ایسی آگئی ہے کہ ہاتھ پاؤں ہلانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ بس وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ گھر پر پڑے ہوئے چارپائی کے بان توڑا کریں اور روپے کی بارش ہوا کرے۔ ان ناصح بزرگوں سے اب کون کہے کہ جناب والا یہ سب کچھ صرف اس لیے ہے کہ آپ کا سایہ ہم کمبختوں کے سر پر ہنوز قائم ہے حالانکہ آج کل عمر طبیعی بس پچاس پچپن سال ہے یعنی پچپن سالہ کی پنشن پاتے ہی انسان کو مرجانا چاہیے"۔ یعنی یہ زبردستی تو ملاحظہ فرمائیے۔ کہ یہ دُہری دُہری عمر طبیعی پانے والے بزرگ مرنا تو بھول جاتے ہیں۔ بس یاد یہ رہ جاتا ہے کہ اپنی نازل کی ہوئی مصیبتوں کو بیکار نوجوانوں کو دن رات لعنت ملامت کیا کریں۔ حالانکہ قصور سب ان ہی کا ہے یہی نوجوان جب "بچے" تھے تو ان ہی قبرستان کا راستہ بھول

جانے والے بزرگوں نے ان بیچاروں کو پڑھانا شروع کیا تھا۔ اور تمام زندگی زبردستی پڑھاتے رہے یہاں تک کہ پڑھانے والے تو قبر میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے، اور پڑھنے والے ایک آدھ درجن بچوں کے باپ بن گئے اب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اپنے بچوں اور باپ دادا سب کا پیٹ پالو۔ تو بیچارے کہاں سے پالیں۔ آرام طلب بنا دینے والے آرام طلبی کا طعنہ دیتے ہوئے کس قدر اچھے معلوم ہوتے ہیں بیکار کر دینے والے بیکاری پر لعنت ملامت کرتے ہوئے کیسے بھلے لگتے ہیں۔ ان ناصحوں سے کوئی پوچھے کہ اگر آپ کو اپنی اولاد کے باکار ہونے کی فکر تھی تو آپ نے اس کو درزی کیوں نہ بنایا، بڑھئی کیوں نہ بنایا، لوہار کیوں نہ ہونے دیا، جوتہ بنانا کیوں نہ سکھایا۔ اور تعلیم شروع کرانے سے قبل گلا گھونٹ کر کیوں نہ مار ڈالا۔ پہلے تو تمام زندگی بیکار ضائع کی، اسکول اور کالج کی "لاٹ صاحبانہ" زندگی بسر کرائی۔ سوٹ، بوٹ، لونڈر کا عادی بنایا اور اس مغالطے میں مبتلا رکھا کہ آنے والا دور موجودہ دور سے زیادہ زریں اور خوشگوار ہے۔ تو اب یہ شکوہ سنجیاں کیا معنی رکھتی ہیں اور تمام دُنیا کا تو خیر جو کچھ بھی حال ہو لیکن ہندوستان جنت

نشان کا یہ حال ہے کہ یہاں بیکاری کے سب اس طرح عادی ہو گئے ہیں کہ گویا ہندوستانی انسان کا مقصد حیات یہی بیکاری ہے جس میں سب مبتلا ہیں۔ ہندوستان ایسے جاہل ملک کے پڑھے لکھے بھی دو کوڑی کے اور جاہل بھی دو کوڑی کے بلکہ جو بیچارے پیدائشی یعنی خاندانی جاہل ہیں اُنکی حالت پڑھے لکھوں سے بدرجہا بہتر ہے اس لیے کہ وہ محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ پال لیتے ہیں اور پڑھے لکھوں کا پیٹ اُن کے متعلقین بھرتے ہیں۔ اس وقت بیکاری کا یہ حال ہے کہ ہندوستان کے کسی شہر میں دیکھیے بہت سے محلے کے محلے ایسے نکلیں گے جہاں آپ کی دعا سے سب خود مختار یعنی آزاد ہو گئے، کوئی کسی کا نوکر چاکر نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ کھاتے کہاں سے ہیں۔ اسکا جواب یہ ہے کہ آپ بھی دُنیا کے تمام کام چھوڑ کر ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ رہیے۔ اور دیکھیے کہ خدا کھانے کو دیتا ہے یا نہیں؟۔ پہلے آپ جائداد پہ ہاتھ صاف کرینگے پھر بیوی کے زیور کی باری آئے گی۔ پھر کٹوروں اور برتنوں پر نوبت پہونچیگی مختصر یہ کہ

خدا باپ دادا کی کمائی ہوئی دولت اور جمع کی ہوئی گھرستی کو رکھے بیوی کے لائے ہوئے زیور کو رکھے اور ان سب کو کوڑیوں کے مول خریدنے والے مہاجنوں کو رکھے، بہر حال آپ انشاء اللہ اچھے سے اچھا کھائیں گے اور جس قدر اچھی زندگی آپ کی گزرے گی۔ وہ تو ان نوکر چاکر قسم کے برسرکار لوگوں نے خواب میں بھی نہیں دیکھی۔

مطلب کہنے کا یہ کہ جس بیکاری سے ایک دنیا چیخ اُٹھی ہے اس سے ہندوستان کیوں گھبراتا ہے۔ ہندوستان تو بقول ہمارے خداوندان نعمت کے ایک جاہل، وحشی، غیر مہذب اور کالے آدمیوں کا ملک ہے۔ یہاں اگر بیکاری ہے تو کیا تعجب۔ جب یورپ ایسے متمدن، تعلیم یافتہ مہذب اور گورے آدمیوں کے ملک میں یہ حال ہے کہ بیچارے صاحب لوگ ہر طرح ناکام ثابت ہو کر وہاں کے ہر شعبۂ ملازمت سے علیحدہ کر دیئے گئے ہیں اور اُنکی جگہ میم صاحبات براجی رہی ہیں اگر خدانخواستہ ہندوستان میں بھی یہی صورت ہو جاتی کہ "اندرون خانہ" ایکدم سے "بیرون خانہ" اور "بیرون خانہ" ایک دم سے "اندرون خانہ" ہو کر رہ جاتے تو شاید یہاں کے لوگ ہندوستان کو حوا کی بیٹیوں کے

لیے چھوڑ کر یا تو کسی ایسی دنیا میں چلے جاتے جہاں ابن آدم کی حکومت ہو یا خودکشی کر لیتے۔ اِس لیے کہ یہ انقلاب ہندوستان کے مَردوں کے لیے ناقابل برداشت ہے کہ ان کی بیویاں تو کچہری عدالت کریں اور وہ خود گھرداری کریں، بچوں کو کھلائیں۔ یعنی مرد پیدا ہو کر عورت کے خرائض انجام دیں۔ تو جناب مطلب کہنے کا یہ کہ یورپ کی بیکاری پھر بھی قابل برداشت ہے کہ وہاں کے مرد بیکار تو عورتیں باکار ہو گئی ہیں۔ ایک در بند ہوا تو دوسرا کُھل بھی گیا۔ اور ہمارے ہندوستان شریف کے تو دونوں در اس طرح بند ہوئے ہیں کہ گویا کنجی ہی کھو گئی۔ لہٰذا اب کبھی کھلنے کی بھی اُمید نہیں ایسی صورت میں اگر ہندوستان کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بیکاری ہمارا مقصد حیات ہے۔ تو بتائیے کیا غلط سمجھتے ہیں؟ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ بیکار جدوجہد کر کے اپنی جان دیدیں۔ یا بے معنی کوششوں کے پیچھے مر جائیں آخر کیا کریں؟ اس بیکاری کا جو علاج ہے وہ ہندوستانیوں سے عمر بھر نہیں ہو سکتا اور اگر ہو سکتا ہو کر دکھیں، ہم جبھی جانیں کہ یورپ کے مردوں کی سی غیرت اور حمیت پیدا کر کے دکھائیں اور اپنے آپ کو عورتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں اور اگر

یہ نہیں ہو سکتا۔ تو آج سے بیکاری کا رونا چھوڑ دیں۔ جب یہ معلوم ہے کہ موجودہ دَور "دورِ القسا" ہے تو پھر بیکاری دُور کرنے کی جدوجہد کرنا فطرت سے جنگ کرنا ہے یا نہیں ؟

کیسی بیکاری اور کیسی کچھ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ جس قدر بیکاری میں انسان کثیر المشاغل ہو جاتا ہے باکاری میں قطعاً نہیں ہو سکتا۔ بیکاری خود ایک ایسا مشغلہ ہے کہ انسان کو اس سے کبھی فرصت نہیں ملتی۔ یقین نہ آتا ہو تو کسی بیکار انسان کا صرف ایک ہفتہ کا پروگرام دیکھ لیجیے اور پھر اندازہ کیجیے کہ کیا اتنا کام آپ زندگی بھر بھی کر سکتے ہیں ؟ یقیناً اگر آپ کو آپ کی دُگنی عمر بھی ملتی تو شاید آپ اس ایک ہفتہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ مثلاً ایک شخص بیکار ہے اور اُس کو کسی مشغلے کی تلاش ہے وہ سب سے پہلے ڈپٹی کلکٹری سے لیکر وکنیٹری تک کے لیے کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح ملازمت مل جائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ارادہ ہے کہ آٹا پیسنے کی چکی لگا کر قسمت آزمائی کریگا۔ اور اس سلسلے کا تمام حساب کتاب مرتب ہو چکا ہے لیکن ایک خیال یہ بھی ہے کہ اگر حیدرآباد میں کوئی ملازمت مل گئی تو اُسکو ترجیح دی جائیگی۔ ایک طرف یہ بھی دل

چاہتا ہے کہ اگر سستی مل جائے تو ایک لاری خرید لی جائے، بڑے نفع کی چیز ہے، لوگوں نے ایک لاری خرید کر اتنا نفع اُٹھایا ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں اُنکے پاس دس دس لاریاں ہو گئیں اور وہ لکھ پتی بن گئے، لیکن اگر ریلوے اسٹیشن پر کتابوں کے فروخت کرنے کی اجازت مل جائے تو کیا کہنا ہے۔ دُگنا اور چوگنا فائدہ ہے اور یہ ہڈی کا کاروبار بھی بڑے نفع کی چیز ہے۔ بس انسان مستقل مزاج اور محنتی ہو پھر روپے کی کوئی کمی نہیں اور ان سب سے اچھا تو یہ ہے کہ ایک ماہوار ادبی رسالہ نکال لیا جائے اور اگر خدا توفیق دے تو روزانہ اخبار سے تو بہتر کوئی بات ہی نہیں مختصر یہ کہ اس کے جیتے ارادے ہوتے ہیں سب اپنی اپنی جگہ مستقل اور اس کا ذہن ہر جگہ کام کرتا ہے۔ یہ خیالی اسکیمیں جب عمل میں آجاتی ہیں اُس وقت کچھ نہ پوچھیے کہ کیا حال ہوتا ہے، یہی بیکار انسان یہ یک وقت ڈپٹی کلکٹر سے لیکر تمام ان عہدوں پر جن کے نام اسکو یاد ہیں ملازم ہوگا، بجلی کا بلاشرکت غیرے مالک ہوگا، ریاست حیدرآباد میں اس طرح ملازم ہوگا کہ عنقریب کوئی "یار جنگ" ہونے کی بھی اُمید ہوگی۔ لاری بلکہ

لاریوں کا مالک ہوگا، ریلوے اسٹیشن کی ٹھیکداری کا شرف بھی حاصل ہوگا۔ ایک ادبی رسالہ کا مدیر اور ایک روزنامہ کا چیف ایڈیٹر بھی ہوگا۔ مختصر یہ کہ جہاں جہاں اسکے دماغ کی رسائی ہوئی ہوگی بس وہ اپنے نزدیک تو ہاں تھوڑی دیر کے لیے عالم تخیل میں سہی بہرحال کامیاب ضرور ہو گیا ہوگا۔ اور اس غریب خیال نے اس بیچارے کی حالت اس کتے کی سی بنادی ہوگی جو شیش محل میں ہر طرف اپنی ہی صورتیں دیکھکر باولا ہوجانے کے قریب ہو، یہ کیفیت اس قدر عام ہے کہ کم یا زیادہ دنیا کے ہر بے روزگار گو تعلیم یافتہ بیروزگار میں فرق موجود ہے اب فرق یہ ہے کہ جو ذرا سمجھدار ہیں یعنی جن پر بیکاری کا ہلکا سا حملہ ہوا ہے یا جنھوں نے اس حملے کا کامیاب مقابلہ کیا ہے وہ تو خیر اس قسم کی تمام تجاویز اپنے ذہن میں رکھیں گے اور انکے یہاں تمام صلاح مشورے بس دل اور دماغ کے درمیان ہوگا۔ یعنی انکی اسکیمیں اول تو کسی کو معلوم نہیں ہونگی اور معلوم بھی ہونگی تو مخصوص لوگوں کو لیکن وہ لوگ جو فطرتاً کمزور واقع ہوے ہیں یا جن کو بیکاری نے ہر اعتبار سے ضعیف بنادیا ہے اس معاملے میں اسی قسم کے انسان ثابت ہونگے جسکا ہم ذکر کرچکے ہیں یعنی انکے

پاس جائیے تو السلام علیکم و علیکم السلام کے بعد جو اس مخصوص محبت گفتگو شروع ہو گی تو اس وقت تک سلسلہ جاری رہیگا جب تک آپ خود "اجازت ہے"؟ - نہ کہیں اور پھر اس گفتگو میں جس بیباقتگی کے ساتھ متکلم محو اور بیخود ہو جاتا ہے - اسکا تعلق بس دیکھنے سے ہے - اس وقت اگر آپ نے اس بیچارے کی گفتگو توجہ کے ساتھ سُن لی تو آپ کا یہ احسان وہ عمر بھر نہیں بھول سکتا، بلکہ آپ کو یہ محسوس ہو گا کہ واقعی یہ بیچارہ صرف میری وجہ سے اب تک زندہ ہے، ورنہ نہیں معلوم کب کا اس خود غرض دنیا کو چھوڑ چکا ہوتا، آپ کی صورت دیکھتے ہی وہ فوراً آپ کی طرف بڑھیگا کہ "السلام علیکم - بھائی - عید کا چاند ہو گئے - کہو کیسی طبیعت ہے اور بھاوج کا کیا حال ہے؟" اگر اسکے جواب میں کہیں آپ نے اسکا حال بھی پوچھ لیا، کہ "خدا کا شکر ہے بھائی اچھا ہوں۔ گھر میں بھی خیریت ہے۔ تم اپنی کہو کہ اس درخواست کا کیا ہوا" بس اسیقدر کافی ہے - گویا آپ نے اجازت دے دی کہ ہاں سناؤ "داستان امیر حمزہ" بس اس نے کہنا شروع کیا۔

"تم کو نہیں معلوم ہوا، لاحول و لاقوۃ، اماں اُس نے تو بہت طول کھینچا، ہوا یہ کہ ڈپٹی صاحب نے اس کو کمشنر صاحب کے پاس بھیجدیا اور

کمشنر صاحب نے لکھدیا کہ جو چاہو کرو، ہم نہیں جانتے۔ اب ڈپٹی صاحب کی پھونک نکل گئی کہ کہیں کمشنر صاحب نے غصے میں تو نہیں لکھا۔ میں جب گیا تو کہنے لگے ڈپٹی صاحب کہ کمشنر صاحب نے نامنظور کر دی۔ میں نے اپنے دل میں کہا یہ کیونکر سکتا تھا جب یہ کمشنر صاحب بریلی میں سٹی مجسٹریٹ تھے تو میں نے اُن کو بڑے دن کا کارڈ بھیجا تھا۔ وہ مجھ کو جانتے ہیں خیر بھائی تو میں چُپ ہو رہا۔ اور میں نے وہی ٹھیکہ والی کوشش شروع کر دی لیکن تم نے کہا تھا کہ دکان کی فکر بھی کرتے رہو۔ تو بھائی میں اس طرف سے بھی غافل نہیں۔ اب جو کچھ بھی خدا کرے مگر آپ کی دعا سے اُمید ہے کہ سب کچھ ہو جائیگا۔ دکان امین آباد میں ہے جس میں چار در ہیں۔ مگر وہ جن کے پاس ہے کہتے ہیں کہ یہ میری ذاتی ہے میں اسکو خالی نہ کرونگا۔ یہ بڑی مشکل ہے اگر کہیں وہ اسکی ذاتی نہ ہوتی تو بس مار لیا تھا۔ مگر اب کیا ہو؟ اور خوب یاد آیا۔ یار وہ دوائوں والی ترکیب تو ایسی لاجواب ہے کہ نہ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ بس تمام ہندوستان کے اخباروں میں اشتہار چھپوا دیتا ہوں۔ پھر کیا ہے۔ جب فرمائش آئی

لیا کوئلہ اور دیوار کا پلاسٹر اور دونوں کو ملا کر پیس لیا۔ بس دوا تیار ہے'
تو یار ایک دن بیٹھکر اشتہار بنا ڈالو۔ مگر تم تو ملتے ہی نہیں۔ اور
وہ سنگر کمپنی کی ایجنسی بھی یوں ہی رہ گئی۔ تم اپنے وعدوں کو بالکل
یاد نہیں رکھتے۔ اچھا تو کل کی رہی۔ ضرور دیکھو، فرق نہ ہو۔"

یہ تمام تجاویز تھیں جن کی تحریک یا تائید میں آپ شریک تھے
یا جن کا آپ سے کوئی تعلق تھا۔ ورنہ اُن حضرات کے ذہن میں تو
نہیں معلوم کتنی تجاویز ایسی بھی ہونگی جن سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں
لیکن آپ کی طرح کے دوسرے ہمدردوں کو دلچسپی ہے۔ مثلاً کسی نے
تو یہ رائے دی ہوگی، کہ ایک ہوٹل کھول لو۔ اب اس شخص سے جو گفتگو
ہوگی وہ تمام تر ہوٹل کے متعلق ہوگی۔ کسی دوسرے شخص نے واشنگ کمپنی
کھولنے کی صلاح دی ہے تو اُس سے واشنگ کمپنی کے متعلق تبادلۂ خیال
کا سلسلہ جاری رہیگا کہ دھوبیوں کا انتظام کہاں سے کیا جائے۔ کتنے
دھوبی کافی ہونگے۔ کم از کم تین الماریاں، دو بڑی میزیں، ایک آفس ٹیبل وغیرہ
کی ضرورت ہوگی۔ اور پھر کپڑا دھونے کی جگہ کا اس طرح انتظام کیا جائے
کہ وہاں پانی کی فراوانی بھی ہو اور وہ جگہ دکان سے قریب بھی ہو۔

مختصر یہ کہ تمام نشیب فراز صرف ایک تجویز سے تعلق رکھتے ہیں اور اس تجویز کا تعلق بھی صرف ایک کرم فرما سے ہے۔ اسی طرح جتنے خدا نے ہمدرد پیدا کیے ہیں۔ اسی قدر مختلف تجاویز بھی ہیں لیکن ان حضرت کا یہ حال ہے کہ ہر شخص کی ہمدردی قبول اور ہر کام کو شروع کرنے کے لیے اس طرح آمادہ کہ بس گویا کل ہی سے شروع بھی ہو جائیگا۔ اگر آپ کو اپنی بتائی ہوئی ترکیبوں کے علاوہ ان تمام تجاویز کا علم ہو جائے جو آپ کے بے روزگار دوست کے ذہن میں ہیں تو آپ کو تعجب ہوگا کہ یہ شخص ایسا دماغ رکھتا ہے جو خزانہ ہے۔ تجاویز کا اور ہر تجویز کے ساتھ ایسی مکمل معلومات اسکے ذہن میں محفوظ ہے۔ کہ وہ "زندہ انسائیکلوپیڈیا" بن کر رہ گیا ہے اور یہ سب اسی بیکاری کے طفیل میں ہوا ہے جس سے وہ کسی نہ کسی طرح چھوٹنا چاہتا ہے۔

یہ جو آپ کثیر التعداد ادبی رسالے دیکھ رہے ہیں اور جو بیشمار دو نکل آئے گویا کہ "مٹی کے پر" کی طرح کے انتشار پرداز پیدا ہو گئے ہیں۔ ان سب کے متعلق اگر آپ تحقیقات کرینگے تو ان کے عالم وجود میں آنیکا سبب زیادہ تر یہی بیکاری ہوئی ہوگی۔ اونھوں نے بیکار ہونیکے بعد یہ سوچا کہ کچھ کرنا

کرنا چاہیے اور کسی نے اُن کو رائے دیدی کہ ادیب بن جاؤ، مضمون لکھا کرو۔ بس اُنھوں نے لکھنا شروع کر دیا، اور ان ہی کی ترکیب کے پیدا ہونے والے رسالوں نے اُن مضامین کو شائع کرنا شروع کر دیا۔ اس "کند ہمجنس باہمجنس پرواز" کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حضرت جن کو حقیقتاً ادب سے کوئی تعلق نہ تھا ادیب بن گئے اور وہ رسالہ جو نہیں معلوم کیا تھا، علمی، ادبی، رسالہ بن گیا۔ اب کر لیجیے جو کچھ آپ کر سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کر سکتے ہیں کہ۔ ع

اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

کہہ کر اپنی "شوکت تھانویت" سے مستعفی ہو جائیں لیکن وہ لوگ تو آپ کی وجہ سے مضامین لکھنا چھوڑ نہیں سکتے۔ جنھوں نے اپنی بیکاری کا علاج اسی کو سمجھا ہے اور جو اپنا پہاڑ کی طرح نہ کٹنے والا وقت مضمون لکھ کر کاٹتے ہیں۔ ایک دن وہ بھی آنے والا ہے کہ اگر ہم غیرت دار ہیں اور وہ حضرات مستقل مزاج لیکن اگر اسی کے ساتھ ساتھ "ایڈیٹر صاحبان رسائل جات" کی قدر شناسیاں بھی باقی ہیں تو ہم واقعی ایک ایسا اعلان کرنے کے بعد غائب ہو جائینگے کہ سب نیچے دل سے کم از کم ایک مرتبہ یہ کہدیں کہ ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اتوار

اتوار

وہ مبارک و مسعود دن جس کی قدر "شاہ داند یا بداند جوہری" یعنے یا تو عیسائی سمجھ سکتے ہیں یا ہمارے ایسے ملازمت پیشہ، ان لوگوں کا یہاں ذکر ہی نہیں جو گھر بیٹھے شنبہ، یکشنبہ، دوشنبہ، سب کو ایک ہی لاٹھی ہانکا کرتے ہیں۔ اور اُن کو خبر بھی نہیں ہوتی، کہ ہفتہ کے بعد کون سا دن آنے والا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ لوگ اتوار کی کیا قدر کر سکتے ہیں۔ انکے نزدیک جیسے بدھ اور منگل ویسے ہی اتوار۔ اس اتوار کی قدر تو کوئی ہمارے دل سے پوچھے کہ یہی وہ دن ہے ع "دن گنے جاتے تھے جس دن کے لیے"۔ یقین کیجیے کہ اس دن کا انتظار پیر کے دن سے شروع ہو جاتا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہمارے ایسے بیچارے ملازمت پیشہ خدا کے بندے اپنی ذاتی زندگی کا دن تمام ہفتہ میں صرف اتوار ہی کو سمجھتے ہیں۔ اسکے علاوہ باقی تمام دن کو بندگی اور بیچارگی میں اس طرح گزرتے ہیں کہ ہم کو اپنے انسان ہونیکا

ایک دفعہ بھی احساس نہیں ہوتا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مشین ہے۔ اگر لکھنے والا بٹن دبا دیا گیا تو لکھ رہے ہیں۔ اگر بیٹھنے والا پرزہ چلا دیا گیا تو بیٹھے ہوئے ہیں۔ مختصر یہ کہ صبح ہوتے ہی دفتر آنا دفتر میں ایک مقررہ خدمت انجام دینا۔ شام کو دفتر سے جانا سب کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ

ع اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

کی ایک متحرک تصویر معلوم ہوتے ہیں۔ ہم نے کبھی یہ بھی غور نہیں کیا کہ علاوہ اتوار کے ہم انسان بھی رہتے ہیں یا نہیں۔ اور نہ اس مسئلہ پر غور کرنے کا موقع ملا۔ لیکن جب کبھی اتوار کے دن ہم نے اپنی زندگی پر غور کیا تو یہی نتیجہ نکلا کہ ہماری زندگی کے دن شمار کرنے والے جو چاہیں شمار کریں لیکن ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ بس اتوار کا دن تو ہماری زندگی کے دنوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ اس کے علاوہ باقی دن تو خدا جانے ہم زندگی بسر کرتے ہیں یا زندگی ہم کو بسر کرتی ہے۔ اب اس سے اندازہ فرمائیے اگر بجائے بہادر شاہ ظفرؔ کے آپ کے جناب غالبؔ صاحب قبلہ ہم کو یہ دعا دیتے کہ؎

تم سلامت رہو ہزار برس　　　ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

یا تو ہم اُن سے کہتے کہ قبلۂ عالم یہ دعا آپ ہی کو مبارک رہے۔
ہم تو ایسی دعا دیجیے کہ ہماری جتنی زندگی بھی ہے اس میں چاہے کچھ
تخفیف کر دی جائے۔ لیکن ہر دن اتوار بن جائے۔ یا کم از کم ہر ہفتہ
میں دو تین مرتبہ تو اتوار آیا کرے۔ ذرا غور تو فرمائیے کہ ایک اتوار کا
دن ہفتہ بھر کے بعد آتا ہے جس میں معمولی دنوں کی طرح بارہ گھنٹے
ہوتے ہیں۔ ان ہی بارہ گھنٹے میں اپنی خوشی کھانا کھائیے اپنی
خوشی نہائیے اپنی خوشی بال بنوائیے۔ اپنی خوشی احباب کے یہاں
جائیے۔ اپنی خوشی احباب کو اپنے یہاں بلائیے۔ اپنی خوشی سیر کو
جائیے۔ اور اگر کہیں اپنی خوشی سو رہے تو تمام کام آئندہ اتوار
تک ملتوی۔ یا اگر بیگم صاحبہ نے موقع غنیمت جان کر اور وقت کی
قدر کرتے ہوئے اپنی خوشیاں پوری کرانا شروع کر دیں تو بس دن بھر
گھر سے بزاز کی دوکان۔ گھر سے اناج کی منڈی۔ گھر سے ٹین والے
کی دوکان۔ گھر سے گوٹا کناری، لیس، بانکڑی والے کی دوکان
سو سو چکر کاٹیے اور چورن چٹنی دال کا مسالہ فراہم کرتے کرتے شام
کو اس طرح تھک کر پڑ رہتے گویا دن بھر ہل جوتا ہے۔ قصہ یہ

کہ ہمارا تمام پروگرام ہفتہ بھر اتوار کے دن کے لیے ملتوی رہتا ہے اور اسی طرح بیگم صاحبہ بھی اتوار کی تاک میں لگی رہتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اتوار کے دن ہمارا ذاتی پروگرام اور بیگم صاحبہ کا پروگرام جو ہمارے پروگرام کا رفیقِ حیات ہوتا ہے مل جُل کر ایسا ہو جاتا ہے کہ ہفتہ بھر کا کھایا پیا نکلوا کر چھوڑتا ہے۔ ہم تو تمام ہفتہ یہ کرتے ہیں کہ بالوں پر ہاتھ پھیرا اور زیرِ لب کہدیا "اب کی اتوار کو بنوائیں گے۔" جوتے پر نظر پڑی اور طے کر لیا۔ "اب کی اتوار کو پالش ہو گی۔" کپڑوں کو دیکھا اور ارادہ کر لیا کہ "اب کی اتوار کو نہا کر بدلیں گے۔" کسی نے نہ ملنے کی شکایت کی تو وعدہ کر لیا اب کی اتوار کو حاضر ہونگا۔ کوئی مر گیا تو تعزیت کے لیے بھی اتوار کا دن مقرر کیا گیا۔ کسی نے ہم سے ملنے کو کہا تو اتوار کا دن دیا۔ کہیں سفر کو جانا ہے تو اتوار کے دن سفر کی ٹھہری۔ شکار کو دل چاہا تو اتوار پر اُٹھا رکھا۔ غرضکہ تمام ہفتہ جو جو باتیں ہم کو اپنی زندگی کے متعلق یاد آئیں ہم نے سب کو اتوار کے سپرد کر دیا۔ لیکن ہم کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ اسی طرح بیگم صاحبہ نمک ختم ہونے پر۔ کپڑے پھٹنے پر۔

زیور ٹوٹنے پر۔ غرضکہ ہر بات پر اتوار کو یاد کیا کرتی ہیں - اور اتوار کے دن ان کو وہ باتیں سوجھتی ہیں کہ ہمارے فرشتوں کو بھی نہیں سوجھ سکتیں - وہ تو کہیے اُس دن ہمارے دفتر کی طرح اسپتال، کچہریاں، ڈاک خانہ، مدرسے وغیرہ سب بند ہوتے ہیں - ورنہ بچوں کو اسپتال لے جانا، اسکول میں نام لکھوانا وغیرہ بھی اسی دن پر اُٹھا رکھا جاتا - اور اب شکر ہے کہ ہم کو اس سے ایک طرح کی یکسوئی حاصل ہے - اس میں شک نہیں کہ اتوار کے دن کی مشغولیتیں معمولی دنوں سے دُگنی اور چوگنی ہوتی ہیں - لیکن اسکے باوجود ہم اتوار کے عاشق صرف اس لیے ہیں کہ وہ تمام مشغولیتیں ہم کو اپنی اور اپنی ذاتی زندگی سے متعلق معلوم ہوتی ہیں اور باقی دنوں میں تو نہیں معلوم ہم کس طرح اور کس کے لیے جیتے ہیں -

ل

یکّہ
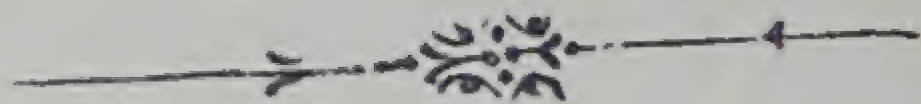
ہم تو کہیں گے کہ اس مغربی سیاح نے نہایت شرافت سے کام لیا ہے جس نے ہندوستانی یکہ کی تعریف صرف یہیں تک کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے گویا کسی مربع صندوق میں دو پہیے لگا کر گھوڑا جوت دیا ہے۔ ورنہ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کا یکہ کسی طرح بھی ان تاریخی یادگاروں سے کم نہیں ہے جو عہد سلف کی یادگار کے طور پر دنیا کے بڑے بڑے عجائب خانوں میں حفاظت کے ساتھ رکھی ہوئی ہیں اور جن کو دیکھکر ترقی یافتہ اقوام اپنی گزشتہ جہالت کے نمونے دیکھتی ہیں۔ لیکن ہندوستان کا یکہ اہل ہند کی جہالت کی یادگار نہیں بلکہ جہالت کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویر ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس عجیب و غریب سواری کے موجد کا دماغ کس ساخت کا تھا جس میں سب سے پہلے یکہ کا نقشہ آیا

جس کا کسی طرف سے کوئی تُک ہی نہیں ہے۔ لوگ تانگہ ہی کو کہتے ہیں کہ یہ سواری دُنیا سے انوکھی ہے کہ مشرق کی طرف جانا ہو تو مغرب کی طرف مُنہ کر کے بیٹھیے۔ اور مغرب کی طرف جانا ہو تو مشرق کی سمت نظر رکھیے۔ لیکن یکّے کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہتا کہ یہ سواری کس طرف سے ہے۔ مغربی سیّاح نے تو اپنی ناتجربہ کاری سے یہیں تک کہا ہے کہ "مربع صندوق میں پہیے لگا کر گھوڑا جوت دیا گیا ہے"۔ لیکن ہم سچ کہتے ہیں کہ اگر ان حضرت کو کبھی یکّہ پر سوار ہونے کا اتفاق ہوا ہوتا تو وہ سوائے اس کے اور کچھ کہہ ہی نہیں سکتے تھے کہ یکّہ پر سوار ہونے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ریڑھ کی ہڈی کے دونوں پہلوؤں میں پہیے لگا دیے ہیں۔ اور ٹانگوں کو بم بنا کر گھوڑا جوت دیا ہے۔ اس لیے کہ ان کے لیے تو یکّہ کی سواری یقیناً نئی چیز ہوتی۔ مگر ہم یکّہ کی سواری کے عادی ہونے کے باوجود یکّہ پر بیٹھنے اور یکّہ کے چلنے کے بعد آج تک یہ نہ سمجھ سکے کہ ہم یکّہ پر سوار ہیں یا یکّہ ہم پر۔ یکّہ ہم کو لیے جا رہا ہے یا ہم یکّہ کو۔ ہمارے بیٹھنے اور گھوڑے کے قدم اُٹھانے کے ساتھ ہی بھبتیوں سے پیدا ہونے والی حشر خیز گڑگڑاہٹ کبھی یہ غور

کرنے کا موقع ہی نہیں دیتی، کہ ہم یکہ پر کیوں بیٹھے ہیں اور ہم کو یہ غیر شریفانہ حرکت بھی کرنا چاہیے تھی یا نہیں۔ اس لیے کہ تھوڑی دیر کے بعد گھوڑے کے قدم جلدی جلدی اُٹھتے ہیں۔ یکہ والے کی ٹخ ٹخ ہنٹر نوازی کی حد تک پہونچ جاتی ہے اور یکہ میں بیٹھنے والے ہمارے اور آپ جیسے مسافر اُس ٹینس کی گیند کی طرح خود بخود اُچھلنے لگتے ہیں جو ریکٹ پر ہر مرتبہ گرے اور گر کر پھر اُچھلے لیکن اگر یکہ پر ایک سے زیادہ یعنی دو یا تین آدمی سوار ہیں تو سب ایک دوسرے سے تمام راستہ میں اس طرح ٹکراتے ہیں گویا کسی پیپے میں پتھر بھر دیے گئے ہیں اور اس کو ہلایا جا رہا ہے، وہ تو کہیے کہ انسان بڑی بے حیا مخلوق ہے ورنہ یکہ کی سواری کے بعد ایک دوسرے سے ٹکرا کر ٹوٹ جانا تو کوئی بات ہی نہیں۔ لیکن اس بے حیائی کے باوجود چلتے ہوئے یکہ پر مُنہ در مُنہ باتیں کرنا کسی وقت بھی خطرے سے خالی نہیں ہے اور لوگ یہ جرأت بھی کم کرتے ہیں۔ اِس لیے کہ خدا جانے کس وقت باتیں کرتے کرتے سر ٹکرا جائے یا ناک رگڑ جائے۔ اور اس قسم کے واقعات ہم نے بہ چشم خود دیکھے اور بگوش خود سُنے ہیں کہ چلتے ہوئے

یکہ پر دوستی بگھارنے والے دوستوں نے باتیں کرتے کرتے سر بھی پھوڑ لیا ہے اور پھر ایک دوسرے سے معافی تک نہ مانگی گئی ہے۔ حالانکہ یکہ پر بیٹھ کر ع

تم اپنا منہ اُدھر کر لو ہم اپنا منہ ادھر کر لیں

بھی کہا ہے۔ لیکن یہ قصے ہیں اُن لوگوں کے جو یکہ کی سواری کو بچوں کا کھیل سمجھتے ہیں اور اس پھانسی کے تختہ سے ذرا بھی نہیں ڈرتے ورنہ کیسی باتیں کرنا کیسا کچھ یکہ پر بیٹھنے کے بعد حواس ہی کس کے قائم رہتے ہیں جو یہ باتیں کرے یکہ پر بیٹھنے کے بعد تو خیر ہم نے سوائے توبہ استغفار کرنے کے اور کسی بات پر آج تک غور ہی نہیں کیا ہے۔ لیکن دوسروں کو یکہ پر سوار دیکھ کر البتہ ہمیشہ لطف آتا رہا ہے اور اس میں شک بھی نہیں ہے کہ یکہ پر سوار ہونے کے بعد انسان اچھا خاصہ تماشا ہو جاتا ہے۔ اگر یکہ خاموشی کے ساتھ جا رہا ہے تو اس پر بیٹھے ہوئے حضرت کسی طرح بھی دسہرے کے ٹیسو سے کم نہیں معلوم ہوتے۔ اور اگر یکہ کی تیزی یکہ نشین کو "الف دو زبر اَن، دو زیر اِن، دو پیش اُن" بنائے ہوئے جا رہی ہے تو ظاہر ہے کہ نٹ کا تماشہ کس کو نہیں اچھا لگتا عجیب عجیب مناظر دیکھنے میں آتے ہیں کبھی تو یکہ نشین صاحب کا

سرِ اقدس چھتری سے ٹکراتا ہے اور وہ یکہ کا ڈنڈا چھوڑ کر اسکو سہلا بھی
نہیں سکتے۔ کبھی یکہ اُن کو اس کھلونے کا ہمشکل بنا دیتا ہے جو ہر
کروٹ سے گرنے کے بعد بیٹھا ہی رہتا ہے۔ کبھی معلوم ہوتا ہے کہ
ان حضرت میں نہایت عمدہ اسپرنگ لگا ہوا ہے جو ان کو قرار
ہی نہیں لینے دیتا۔ مختصر یہ کہ ایسی ایسی گت بنتی ہے کہ بس اسکا
دیکھتے ہی سے تعلق ہے۔ لیکن افسوس ہے تو صرف یہ کہ یکہ پر بیٹھنے والا
خود اپنی ان "چارلی چپلانہ" حرکتوں کو نہیں دیکھ سکتا۔

یکہ پر سوار ہونا بھی کوئی ایسا دیسا کام نہیں ہے بلکہ اسکے لیے
بھی بہت بڑے تجربے کی ضرورت ہے ورنہ یکہ پر بیٹھ کر مرنے سے
کہیں زیادہ یکہ کے نیچے کچل کر مرنا آسان ہے۔ اس لیے کہ کوئی یکہ
یکساں نہیں ہوتا۔ اگر آج ہم ایک یکہ پر سوار ہو چکے ہیں اور اسکے
تمام نشیب و فراز بخوبی سمجھنے کی کوشش کی ہے تو اسکے معنی یہ نہیں
ہوئے کہ ہم دوسرے یکہ پر اپنے پہلے تجربہ کو کام میں لا سکیں گے۔
غلط فہمی ہمیشہ یکہ نشینوں کو دھوکہ دیتی ہے۔ بات اصل میں یہ ہے
کہ یکہ کی ہزارہا قسمیں جن میں سے دو موٹی موٹی قسمیں "ادلار"،

اور "دباؤ" ہیں۔ فرض کیجیے کہ آپ کسی ایسے یکہ پر بیٹھے ہیں جو آپ کو پیچھے کی طرف گرائے دیتا ہے جس کا گھوڑا بہت اونچا ہے۔ جس کے بم آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ تو وہ یکہ از قسم "اولار" ہے۔ اور اُس پر آپ کو اونٹ گاڑی کا لطف آئیگا۔ بلکہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اونٹ گاڑی ہی کی چھوٹی قسم ہوتی ہے۔ اُس یکہ پر بیٹھنے کے لیے اس بات کی اشد ضرورت ہوتی ہے کہ اپنے کو گھوڑے سے قریب رکھنے کی کوشش کی جائے۔ اور اپنا تمام بوجھ بموں کو جھکانے کے لیے یکہ کے اگلے حصے کی طرف رکھنے کی کوشش کی جائے ورنہ گھوڑے کے قدم زمین سے اُٹھ جائیں گے اور وہ ترازو کے ہلکے پلے کی طرح اس طرح اُٹھ جائیگا کہ آپ باٹ والے پلہ کی طرح زمین پر آرہیں گے۔ یا آپ کے بوجھ سے گھوڑے کا سینہ بند وغیرہ ٹوٹ جائے گا۔ اور آپ کو ایک دھماکے کی آواز کے بعد خبر ہوگی کہ گر پڑے ہیں۔ گھوڑا اگر شریف ہے تو کھڑا رہیگا ورنہ اسکا جو جی چاہے کرے وہ آزاد ہے اور آپ قسمت کے لکھے کے پابند جو کچھ مقدر میں ہے وہ ہو کر رہیگا۔ اسی طرح یکہ کی دوسری قسم وہ ہے

جس کو " دباؤ " کہتے ہیں ۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ اس کی تمام علامات پہلی قسم کے بالکل برعکس ہونگی یعنی گھوڑا نیچا ہوگا اور یکہ اونچا۔ آپ بجائے پیچھے کے اوندھے منہ گرنے کے خطرے میں ہونگے ۔ اور اس قسم کے یکہ پر سوار ہونے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ گویا آپ کی ران سواری میں آسٹریلیا کا مشہور جانور کانگرو ہے جس کی اگلی ٹانگیں چھوٹی اور پچھلی بڑی ہوتی ہیں ۔ جب تک آپ اس قسم کے یکہ پر سوار رہیں گے ۔ آپ کو بار بار یہ شبہ ہوگا کہ شاید موسم گرما گزارنے کے بعد پہاڑ سے اُتر رہے ہیں ۔ لیکن یہ واضح رہے کہ یہ قسم پہلی قسم سے کہیں زیادہ خطرناک ہے ۔ اُس میں تو صرف یہی ہے کہ چاروں خانے چت گر پڑے اور بس ۔ لیکن اس میں اول تو اوندھے منہ گرنا پڑتا ہے ۔ دوسرے گرنے کے بعد یکہ کے سوار ہونے اور گھوڑے کے روندنے کا ہر وقت امکان رہتا ہے ۔ جس کے بعد یکہ کا سفر عدم آباد کا سفر بن سکتا ہے ۔ لہذا اس قسم کے یکہ پر اس طرح بیٹھنے کی ضرورت ہے کہ گویا آپ محل کے شہ نشین میں مسند پر گاؤ کے سہارے بیٹھے پیچوان سے دل بہلا رہے ہیں ۔ واضح رہے کہ میں نے پیچوان کہا ہے کو چوان نہیں

کہا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ غلط فہمی میں مبتلا ہو کر کوچوان سے دل بہلانا شروع کر دیں اور نہ بھی گرتے ہوں تو اوندھے مُنہ گر پڑیں اس لیے کہ کوچوان عام طور پر یکہ کے اگلے حصے میں بیٹھتا ہے۔ اور دباؤ یکہ کا اگلا حصہ۔ پس یہ سمجھ لیجیے کہ توپ کے مُنہ یا فضاؤں میں بگڑ جانے والے ہوائی جہاز سے کسی طرح کم خطرناک نہیں ہوتا۔ لہذا کیا ضرورت ہے کہ یکہ والے سے پینگ بڑھا کر ملک الموت سے تعلقات پیدا کیے جائیں۔ دباؤ یکہ پر جہاں تک ہو سکے یکہ والے سے دور ہی رہنا چاہیے، تاکہ گھوڑا "بار سواری نتوانست کشید" کا عذر لنگ کر کے آرام لینے کے لیے بیٹھ نہ جائے۔ اور آپ اس کو بیٹھا ہوا دیکھ کر سڑک پر لیٹ نہ جائیں۔

اس میں شک نہیں کہ یکہ پر بیٹھا ہوا آدمی اور پاڑ پر چڑھا ہوا مزدور تقریباً ایک ہی حالت میں ہوتے ہیں کہ ذرا چوکے اور قبر تیار ہے مگر بعض مجبوریاں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ یکہ کی سواری سے اجتناب نہیں کیا جا سکتا اور بدرجہ مجبوری اپنے کو موت کے سپرد کرنا پڑتا ہے ان صورتوں میں یہ بھی تو آسان ہے کہ بجائے یکہ کے اس کے

گھوڑے کی سواری لے لی جائے۔ یا یکہ والے سے کہا جائے کہ بھائی تکلیف تو ہوگی مگر ذرا تم خود بجائے گھوڑے کے یکہ کو کھینچکر ہم کو پہنچا دو تمہارا فرض اگر گھوڑا نہ پورا کر سکیگا تو ہم ادا کر دینگے۔ چاہے دو چار پیسہ زیادہ لے لینا۔ حالانکہ یہ بات ابھی تو ناممکن سی معلوم ہوتی ہے لیکن جب دستور ہی یہ ہو جائیگا کہ یکہ والے ہی یکہ کو کھینچا کریں تو اس وقت یقیناً موت کے امکانات محدود ہو جائیں گے اور یہ بات بھی کوئی نئی نہ رہیگی۔ آخر رکشا بھی انسانی شکل وصورت کے گھوڑے کھینچتے ہیں وہی صورت یکوں کی بھی سہی۔

اوّل تو یکہ اب تک ہندوستان میں رائج رہنا دامن ہندوستان پر بدنما داغ ہے اور اس فرسودگی بلکہ جھکڑے پن کو جلد سے جلد ختم کرنا چاہیے۔ لیکن اگر ہندوستانیوں کو یہ سواری ایسی ہی عزیز ہے کہ وہ اپنے باوا آدم کی سواری کو باقی رکھنا چاہتے ہیں تو کم از کم یہ تو کریں کہ پہلے اپنی اپنی زندگیوں کا بیمہ کرالیں تاکہ اُنکے یکہ پر بیٹھنے کے بعد اُن کی اولاد خانقوں نہ مرے۔ اور اگر وہ اپنی زندگی کا بیمہ کرائے بغیر یکہ پر سوار ہوں تو اُس سے کہیں زیادہ اچھا ہے کہ فوج میں

نوکری کریں اور ناگہانی موت مرنے کے بجائے سینہ پر گولی کھاکر
مریں یا ردوبارا انگلستان کو بیرا کی سیکھے بغیر عبور کرنے کی کوشش میں
شہادت کا درجہ حاصل کریں تاکہ دُنیا میں نام بھی ہو اور مچھلیوں کا
پیٹ بھی بھرے - اس میں شک نہیں کہ یکہ نے زمانہ کے ساتھ کافی
ترقی کی ہے اور وہ بھی ربڑ ٹائر وغیرہ ہو گیا ہے - لیکن یکہ پھر بھی یکہ
ہوتا ہے جس کا کام ہے سواریوں کو یعنی یکہ نشینوں کو گرانا، زخمی کرنا
بلکہ اکثر اوقات مار بھی ڈالنا - اور یہ نقص براہ راست تعلق رکھتا ہے
گھوڑے سے - لہذا جب تک یکہ کی ساخت وہی ہے جس کو شکار
کھیلنے کے مچان کے علاوہ اور کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا - اور پھر اس میں
گھوڑا بھی جوتا جاتا ہے اس وقت تک اُس کی سواری خطرہ سے خالی
نہیں - اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوسری سواریوں میں
گھوڑے کا جوتا جانا کیوں خطرناک نہیں ہے - اور یکہ میں جوتا جانا
کیوں خطرناک ہے - اس کا جواب اگرچہ تشریح طلب ہے مگر مختصراً
عرض ہے کہ چارپائی میں گھوڑے کو جوتنا اور یکہ میں گھوڑا لگانا تقریباً
یکساں ہے - دوسری سواریوں میں تو یہ ہے کہ گھوڑے کے گرنے یا

سواری کے اُلٹنے کے بعد اس میں بیٹھا ہوا آدمی اسی کے اندر گر یگا۔ اور تھوڑا بہت زخمی ہونے کے علاوہ بخیریت رہیگا۔ بلکہ یکہ کے اُلٹنے یا یکہ کے گھوڑے کے گرنے کے بعد یکہ نشین تو ہمیشہ سڑک پر گریگا، اور اس طرح گر یگا کہ پہلے وہ گرا پھر اس پر یکہ اور ممکن ہے کہ یکہ پر گھوڑا بھی ہو۔ مختصر یہ کہ یہ گرنا ایسا ہوتا ہے کہ اگر بچ گئے تو سمجھیے کہ پھر سے پیدا ہوے۔ ورنہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ بڑے اچھے آدمی تھے۔ مگر مشیت ایزدی میں کیا چارہ؟

تو جناب مختصر یہ ہے کہ مہذب ممالک کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہاں دوا کے طور پر آنکھوں میں لگانے کے لیے بھی یکہ نہیں ملتا۔ اور ہندوستان کی پستی کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ یہاں اب تک بڑے بڑے شہروں میں یکے چلتے ہیں اور کسی کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ زمانہ یکہ کا زمانہ نہیں ہے۔ یہ تو اُس وقت کی چیز تھی، جب شاہان مغلیہ میں سے کسی کے پاس معمولی سی فورڈ کار تک نہ تھی، اور اُن کے موٹر بیل ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب تو لوگ ہوائی جہاز خریدنے کی فکر میں ہیں۔ اور موٹروں کی کثرت نے گھوڑے اور گدھے کو برابر کر دیا ہے

کہ جس طرح گدھا ران سواری میں رکھنا معیوب سمجھا جاتا ہے اسی طرح
گھوڑا رکھنا حماقت ہے چہ جائیکہ گھوڑا مع ایک عدد یکہ ہو۔
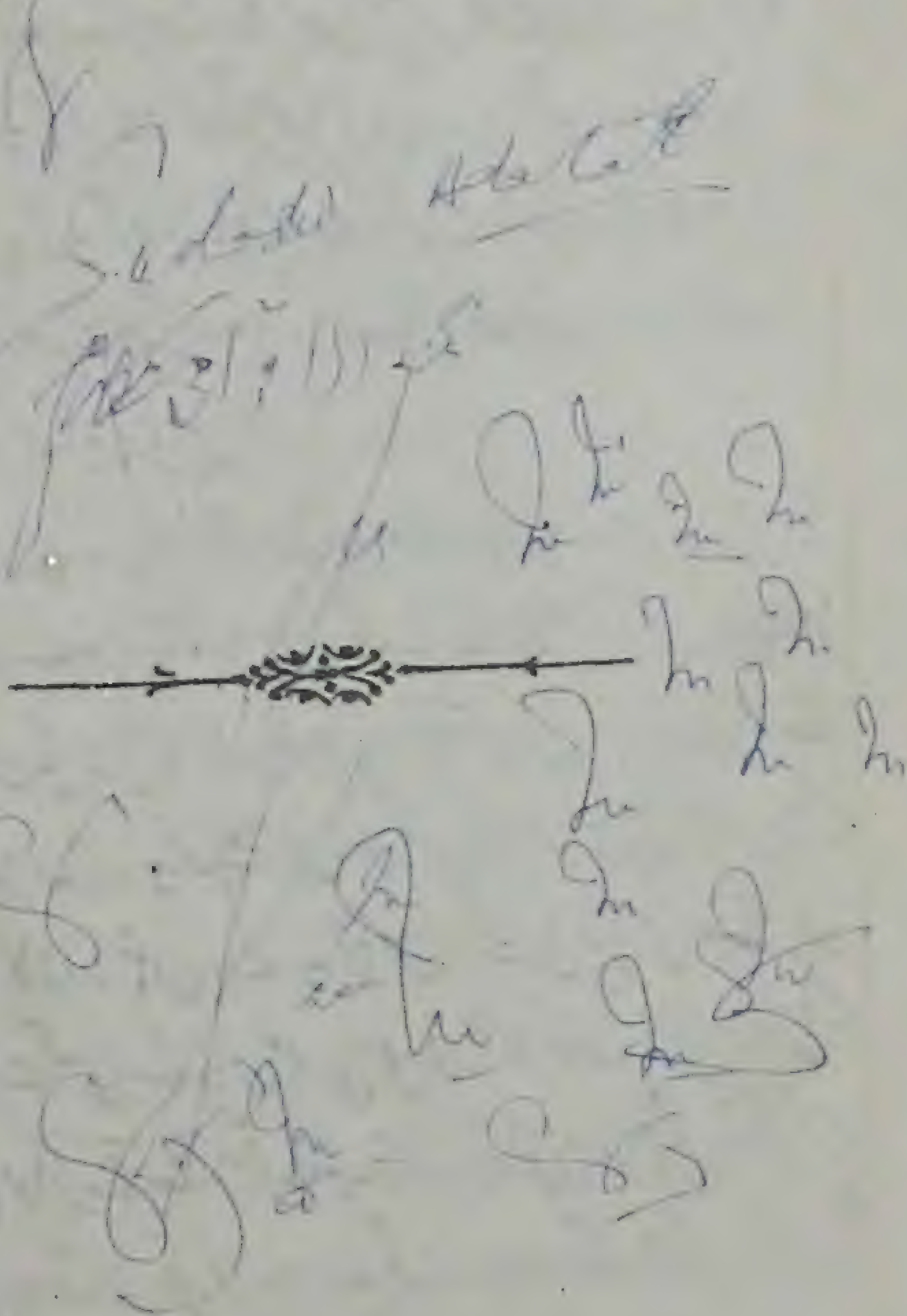
سودیشی عدالت

سُودیشی عدالت

"سوراج میں وکیل مفت ملا کرینگے" یہ ہمارا قیاس نہیں بلکہ کانگریس کے صدر بردولی سردار ولبھ بھائی پٹیل کا بیان ہے جس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سوراجی عدالتیں کیسی ہونگی۔ صدر کانگریس کے اس بروقت اعلان نے ہمارے خیالات کو تقویت پہونچائی، اور ہمارے ذہن میں جو رہے سہے شکوک تھے وہ بھی رفع ہو گئے۔ ورنہ ہم پہلے ہی سے سوراجی عدالتوں کا تصور کیے بیٹھے ہیں اور ہمارے پیش نظر ابھی سے وہ منظر ہے جو سوراج ملنے کے بعد نظر آنے والا ہے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ ایک دن ہمارے دوست جو پہلے رامجس تھے اور اب مہاشے رامجس جی مہراج ہیں ہم سے خواہ مخواہ سٹی مجسٹریٹ کی عدالت کے احاطہ میں اُلجھ پڑے کہ "اجی لاحول ولاقوۃ انگریزی عدالتوں میں آنا بھی کس قدر تکلیف دہ ہے کہ نہ اُٹھنے کی جگہ نہ بیٹھنے کی

جگہ گواہی دینے کیا آئے ہیں کہ گویا کسی عذاب میں مبتلا ہو گئے ہیں۔
ابھی کوئی انگریز گواہ آتا پھر آپ دیکھتے کہ کیا ہوتا۔ مگر ہم تو ہیں غلام۔
لہٰذا غلام گردش میں پڑے ہوئے ہیں“۔ عرض کیا کہ ”مہاتماجی
آپ نے کیا فرمایا کہ انگریزی عدالت میں آنا تکلیف دہ ہے؟“
کہنے لگے ”اور نہیں تو کیا یہ انگریزی ہی عدالت تو ہے جہاں کوئی
ہم کو ٹکے کو بھی نہیں پوچھتا“۔ عرض کیا ”کہ اگر دیسی عدالت ہوتی
تو کیا کوئی بہتر انتظام ہوتا؟“۔ اپنے چہرہ کو سوالیہ نشان بنا کر کہنے لگے
کہ ”کیا آپ سوراجی عدالت کے اس سے بہتر ہونے میں کوئی شک
بھی کرتے ہیں؟“ عرض کیا۔ ”شک نہیں بلکہ مجھ کو یقین ہے کہ اول تو
انشاء اللہ سوراج میں عدالت ہی نہ ہوگی اور اگر ہوئی بھی تو عدالت
کاہے کو ہوگی بھانڈوں کی نقل ہوگی“۔ بڑی زور سے ڈانٹ کر فرمایا
”کیا بکتے ہو، بھانڈوں کی نقل ہوگی۔ تم لوگ تو بس اسی قابل ہو کہ
تم کو خوب ذلیل کیا جائے۔ بات یہ ہے کہ غلامی کرتے کرتے دماغوں
میں بس یہ سما گیا ہے کہ خود ہم تو کسی قابل ہیں ہی نہیں۔ جو کچھ ہیں صاحب
ہیں۔ اور انھوں نے جو قسمت ہماری بنا رکھی ہے وہی ہمارے لیے

بہت ہے" عرض کیا کہ " سچ کہتے ہو۔ مہاشہ جی۔ لیکن قصہ اصل میں یہ ہے کہ ہم غلام رہتے رہتے واقعی غلام ہو کر رہ گئے ہیں اور ایک دم سے آقا نہیں بن سکتے۔ اگر اتفاق سے آقا بنا بھی دیئے جائیں تو آقا ہونے کے باوجود اپنی اوقات سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس کے لیے ایک زمانہ چاہیئے ہے کہ ہم آقا بن کر خاندان غلاماں کے نہ معلوم ہوں، کیا آپ کو اس سے انکار ہے کہ جب ہم کو سوراج ملیگا تو ہم سب سے پہلے اس ذمہ داری کو گڑیوں کے کھیل کی طرح قبول کریں گے اور اس اہم ذمہ داری کو قبول کرنے کے بعد ذمہ دارانہ کاموں کو اس طرح انجام دینگے گویا کسی ہندوستانی تھیٹر میں کانک کا پارٹ کر رہے ہیں۔ ابھی ہم اتنے اہل نہیں ہوئے ہیں کہ حکومت کے نظم و نسق کے معیار کو موجودہ معیار کے مطابق رکھ سکیں" نہایت حقارت کے ساتھ منہ چڑھانے کے انداز میں کہنے لگے۔" اجی جانے بھی دیجئے چلے وہاں سے نظم و نسق۔ نظم و نسق کو کیا لیکر چاٹیں گے اور ہم اس قابل ہو ہی کیسے سکتے ہیں جب ہم کو غلام بنا کر رکھا گیا ہے اور اس پر زور دیا جا رہا ہے کہ ہم ہمیشہ غلام ہی بنے رہیں" عرض کیا۔ یہ ٹھیک

ہے۔ لیکن آپ خود ہی اندازہ کیجیے کہ ہم پہلے سے زیادہ اب قابل ہوے ہیں یا نہیں۔ اسی طرح تھوڑے دنوں میں ہم اور بھی زیادہ قابل ہو کر اپنے ملک کو اپنے ہاتھ میں لے سکیں گے لیکن ابھی نیم قابل ہونے کی صورت میں ہمارا بے لگام ہو جانا دہی بے ڈھنگے اور مضحکہ خیز نتائج پیدا کریگا۔ جس کو میں بھانڈوں کی نقل اور ہندوستانی تھیٹر کا کامک کہتا ہوں"۔ عاجز آکر کہنے لگے "تو تم چاہتے ہو کہ یہی ذلتیں رہیں۔ یہی خواریاں رہیں کہ کچہری میں گواہی دینے آئے ہیں اور ملزموں کی طرح خدائی خوار منہ اُٹھائے پھر رہے ہیں"۔ عرض کیا کہ "ملزم تو خیر خدائی خوار نہیں پھرتے وہ تو نہایت آرام سے ہتکڑیاں پہنے ہوے بیٹھے ہیں۔ البتہ اتنا فرق ضرور ہے۔ کہ انگریزی عدالت میں آپ کو غصہ آرہا ہے۔ آپ تضیع اوقات سے تنگ آرہے ہیں۔ آپ کو تکلیف ہو رہی ہے لیکن آپ حاضر عدالت رہنے پہ مجبور ہیں۔ اور اگر کہیں سوراجی عدالت ہوتی تو آپ کب کے "ایسی تیسی میں جائے" کہہ کر گھر روانہ ہو گئے ہوتے، اور کانگریسی رضاکار آپ کو ڈھونڈھ رہے ہوتے"۔ کہنے لگے "تو پھر"۔ عرض کیا۔ "تو پھر کیا، اب آپ ہی

اندازہ فرمائیے کہ یہ عدالت ہے یا وہ ہوتی۔" ہم کو بیوقوف بنانے کے انداز سے کہنے لگے۔ "عجیب آدمی ہو تم بھی۔ یعنی خود ہی تم نے سوراجی عدالت کو آرام دہ ثابت کیا ہے اور خود ہی پوچھتے ہو۔ یہ عدالت ہے یا وہ ہوتی۔" عرض کیا ہے کہ "یہ تو صحیح ہے لیکن وہ عدالت نہیں ہوتی وہ ہوا خالہ جی کا گھر اور یہ خالہ جی کا گھر نہیں یہ ٹھہری عدالت۔" کہنے لگے "تم بالکل غلام ہو۔" عرض کیا "درست ہے۔" کہنے لگے "اپنی عدالت کے ہم خود مالک ہونگے اور عدالت ہماری ہوگی۔ ہم کو اختیار ہوگا کہ جو چاہیں کریں۔ ہم حاکم وقت ہونگے۔ ہمارا راج ہوگا۔ ہم کسی کے غلام تو ہونگے نہیں کہ ذراسی گواہی کے لیے سات سات دن بیگاریں پکڑے بیٹھے رہیں۔ جیسے کسی کے باپ کے نوکر ہیں۔" عرض کیا۔ "کہ مہاشے جی بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ ہم نے بھی سوراجی عدالت کے لیے یہی رائے قائم کی ہے جو تم کہہ رہے ہو دیکھو میں تم کو ایک دھندلا سا خاکہ کھینچ کر بتاتا ہوں کہ سوراجی عدالت کیسی ہوگی۔"

مہاشے جی ٹہلتے ٹہلتے درخت کے سایہ میں بیٹھ گئے اور ہم نے اسکو

اجازت سمجھکر کہنا شروع کیا۔ "ہوگا یہ کہ زیادہ تر مقدمات سودیشی اور بدیشی کے جھگڑے میں قائم ہوا کرینگے۔" کہنے لگے۔ "یہ کیا؟" عرض کیا "بس آپ سُنتے جائیں میں سب بتادونگا۔ اول تو سوراجی راج میں سب سے بڑا جُرم بدیشی اشیاء کا فروخت کرنا ہوگا۔ اور پھر دوسرے نمبر کا جُرم اُن غیر ملکی اشیاء کو خریدنا ہوگا۔ فرض کیجیے کہ کانگریسی رضاکار کسی کو بدیشی کپڑا فروخت کرتے اور کسی کو بدیشی کپڑا خریدتے دیکھیں گے تو وہ فوراً دو چار کی تعداد میں ایک قومی جھنڈا لیکر جو اس وقت حکومت کا جھنڈا ہوگا۔ موقع واردات پر پہونچ جائیں گے۔ اور دُکاندار اور گاہک دونوں کو ملزم نمبر ایک اور ملزم نمبر دو بنا کر سوت کی بٹی ہوئی موٹی سی رسّی میں باندھ لیں گے اور "بدیشی کپڑا بیچنا حرام ہے، بدیشی کپڑا خریدنا حرام ہے"۔ کہتے ہوے ان دونوں بدنصیب "حرامکاروں" کو بھرے بازار سے گھماتے ہوے کانگریس کے مقامی دفتر میں پہنچینگے۔ جسکو آپ چاہے تھانہ کہیے چاہے عدالت، یہاں پہونچکر ان بیچاروں کو کھڑا کر دیا جائیگا، اور رضاکار فرش پر نہایت اطمینان سے پیر پھیلا کر بیٹھ جائیں گے۔ اور وہ غستی جی نما حاکم وقت جو گاؤ تکیہ کے سہارے

ڈسک پر بھی کھاتہ کھولے ہوئے بیٹھے ہونگے دریافت کرینگے "کہو کیا قصہ ہے؟" اُس وقت ایک رضاکار آگے بڑھ کر بیٹھے ہی بیٹھے کہیگا "پنڈت جی بات یہ ہے کہ یہ میاں جی چپکے سے گلی میں گئے اور ان دوسرے میاں صاحب کی دکان پر کچھ کپڑا خریدا۔ ہم بھلا کب چوکنے والے تھے ہم فوراً تاڑ گئے کہ مال بدیشی ہے اور ہم نے سیتارام سے کہا کہ دوپٹہ الیٹروں کو بلالو تو ہم ابھی دونوں کو دھرے لیتے ہیں۔ سیتارام دو اور آدمیوں کو بلا لائے اور ہم نے ان کو گرفتار کر لیا ہے۔ ان کے پاس یہ بدیشی کپڑا تھا جو اُنھوں نے خریدا ہے اور اُنھوں نے بیچا ہے۔" حاکم عدالت یعنی پنڈت جی اپنے رضاکار کا بیان سُن کر فوراً حکم سنائیں گے نہ وکیل کی ضرورت نہ گواہ کی، نہ جرح کی حاجت نہ صفائی کی بحث کا جھگڑا نہ پیشی بڑھانے کا بکھیڑا۔ بس وہ فوراً کہیں گے کہ یہ "کپڑا لیکر تو ابھی ہولی جلا دو اور جنھوں نے کپڑا خریدا ہے۔ اُن کے دام ضبط بلکہ اُن سے کہو کہ ابھی جا کر سودیشی بھنڈار سے اسکی دوگنی رقم کا کھدر خریدیں یہ اُن پر جرمانہ ہے۔ اور بیچنے والے کی دکان کی تلاشی لیکر سب بدیشی مال برآمد کرو جو جلسہ کے دن ہونے والی ہولی میں جلایا جائے گا اور اُن پر ایک سو ایک روپیہ

جرمانہ اس جرمانہ میں سے اکاون روپیہ تو کانگرس فنڈ کے ہوئے۔ باقی رہے پچاس۔ اس میں سے پچیس ہمارے، اور پچیس میں تم سب۔" اس حکم کے بعد رضا کار عذر پیش کریگا۔ کہ "واہ پنڈت جی سب کیا دھرا تو ہمارا ہے اور تم کہتے ہو کہ پچیس روپیہ میں سب۔" پنڈت جی قائل ہو کر حکم دینگے کہ "نہیں دس روپے تمھارے اور باقی پندرہ روپیہ میں یہ تینوں۔" اس قسم کی ہو گی وہ عدالت جس پر جناب کو ابھی سے ناز ہے اور اس وقت آپ کی گردن نیچی ہو گی۔" مہاشہ جی بڑے غور کے ساتھ سنتے رہے اور جب نتیجہ پر پہونچ کر اُن کو یہ معلوم ہوا کہ یہ تمام نقشہ شروع سے آخر تک مضحکہ خیز تھا۔ تو ترشروئی کے ساتھ کہنے لگے "دل لگی کرتے ہو تم، مذاق اُڑاتے ہو، بیوقوف بناتے ہو۔ لیکن ابھی بعض لو اُس وقت تم خود دیکھو گے کہ کیا ہوتا ہے پھر اس مذاق اُڑانے کا پتہ چلے گا۔ عرض کیا "گستاخی معاف کیا خاکسار نے کوئی غلط بات عرض کی ہے۔" کہنے لگے۔ "اور نہیں تو کیا سچ ہے۔" عرض کیا "اب قبل از وقت میں کیونکر ثابت کر سکتا ہوں کہ میں نے جو خاکہ کھینچا ہے وہ مذاق نہیں بلکہ وہی تخیل ہے جو سوراجی مستقبل کے متعلق میرے ذہن میں موجود ہے

اب وہ خود ہی مضحکہ خیز ہو تو دوسری بات ہے لیکن میں نے تو سنجیدگی
کے ساتھ یہی رائے قائم کی ہے۔" کہنے لگے" تمھارے ذہن میں تو بھرا ہوا
ہے کوڑا میں تم کو بتاتا ہوں کہ ہماری اپنی عدالت کیسی ہوگی۔ سنو، ہماری
عدالت میں سب سودیشی ہوگا، فرنیچر سے لیکر حاکم تک اور حاکم سے لیکر
چپراسی تک کوئی بدیشی نہ ہوگا۔ البتہ اگر ضرورت ہوگی تو جس طرح آجکل
ہندوستانی چپراسی رکھے جاتے ہیں اور انگریز حاکم اسی طرح اس وقت
ہندوستانی حاکم ہونگے اور انگریز چپراسی۔ حاکم اور کلرک، وکیل اور بیرسٹر
چپراسی اور سپاہی، پیشکار اور اہلمد، مدعی اور مدعا علیہ، گواہ اور تماشائی
سب کھدر پہنے ہوئے ہونگے۔ زبان وہی ہوگی جس کو برج بھاشا کہتے
ہیں اور انگریزی بولنے والا عدالت سے نکال دیا جائے گا جس وقت
سفید رنگ کے نورانی کھدر میں ملبوس چپل پہنے ہوئے حاکم کمرۂ عدالت
میں آئے گا اس وقت کوئی نہ سمجھ سکیگا کہ یہ کون ہے لیکن فوراً ہی
"بندے ماترم، انقلاب زندہ باد، مہاتما گاندھی کی جے" کے تین نعرے
بلند ہونگے اور حاکم اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کریگا۔ اس وقت سب
سمجھ جائیں گے کہ یہی حاکم ہے اور اُس کو سب جگہ دیدینگے اور وہ اپنی جگہ پہ

بیٹھ جائے گا۔ اس کے بعد باقی تمام لوگ فرش پر آرام سے بیٹھ جائینگے۔
حاکم مقدمہ اس طرح شروع کریگا جس طرح آج کل ہوتا ہے البتہ
نہ حاکم میں وہ فرعونیت ہوگی جو آج کل حکام میں ہوتی ہے اور نہ
وکیلوں کے وہ نخرے ہونگے جو آج کل کے وکیل کرتے ہیں۔ بات یہ ہے
کہ حاکم کی تنخواہ آج کل کے حاکموں کی تنخواہوں کی طرح غریبوں کا پیٹ
کاٹ کر ہزار ہزار اور ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار نہ ہوگی۔ اس لیے کہ خود وائسرائے
کی تنخواہ پانچ سو ہوگی۔ اس حساب سے حاکم عدالت بھی دس روپے
سے لیکر پچاس روپیہ تک کی تنخواہ کے ہوا کرینگے۔ اُن بیچاروں میں
وہ ریاست اور وہ غرور ہو ہی نہیں سکتا جو ان بڑی بڑی تنخواہ پانے والوں
میں ہوتا ہے اور جب اُن میں غرور نہیں ہوگا تو ظاہر ہے کہ نہ وکیلوں
میں نخرے ہونگے نہ پیشکاروں کے دماغ آسمان پر ہونگے۔ نہ اہلمدوں
کی خدائی ہوگی۔ سب بیچارے سیدھے سادھے ہونگے۔ ہاں تو جب وقت
مقدمہ شروع ہوگا اُس وقت سب سے پہلے حلف لیا جائیگا۔ اور حلف
لینے کا طریقہ یہ ہوگا کہ پیشکار یا کوئی چپراسی ایک چھوٹا سا کھدر کا
جھنڈا بیان دینے والے کو دیگا۔ اور بیان دینے والا اسکو ہاتھ میں

لیکر قسم کھائیگا کہ میں اس سبز سفید اور سُرخ قومی جھنڈے کو ہاتھ میں لیکر قسم کھاتا ہوں کہ جو کچھ کہونگا سچ کہونگا۔ اسکے بعد وہ نام عمر، باپ کا نام اور پیشہ وغیرہ بتاکر اپنا بیان شروع کریگا۔ اُس پر فریق ثانی کا وکیل جرح کریگا، اور باقی تمام کارروائی اسی طرح عمل میں آئیگی جس طرح آج کل ہوتی ہے۔ لیکن عدالت جس وقت فیصلہ سُنائیگی وہ آج کل کے فیصلہ سے ذرا مختلف ہوگا یعنی یہ کہ اگر کسی کو سزا دینا ہے تو سزا جیل وغیرہ کی نہ ہوگی اس لیے کہ جیل کی سزا غلاموں کو دی جاتی ہے آزادوں کو نہیں دی جائیگی۔ مثلاً تا برخاست عدالت چرخہ کاتو یا کانگریس میں جو چندہ دیتے ہو وہ ایک سال کے لیے یا ہمیشہ کے لیے دوگنا کردو یا بھوک ہڑتال کرو یا چھ مہینہ تک کھدر پہنو یا سال بھر تک نمک بناؤ وغیرہ اگر ان سزاؤں کو ملزم نے تسلیم کرلیا تو خیر ورنہ اُس سے بڑی عدالتوں میں اپیل کرسکیگا یہاں تک کہ اس کا مقدمہ بعدالت مہاتما گاندھی بھی پیش ہوسکے گا اور وہاں سے جو اُسکو سزا دی جائیگی وہ قطعی ہوگی ہاں اگر چھوٹی ہی عدالتوں میں معاملہ رفع دفع ہوگیا تو پھر کوئی بات نہیں ہے مگر یہی کیا کم ہے کہ ہمارے

سوراجی بھارت

سوراجی راج میں جیل خانوں کی بہی نہ ہوگی اور پھانسی تو بالکل ہی نہ ہوگی۔ اب یہ سوال ہو سکتا ہے کہ پھر خون کرنے والوں کو کیا سزا دی جائیگی۔ اسکے متعلق یہ ہوگا کہ قاتلوں کو زندگی بھر بھوک کی ہڑتال کرنے کی سزا دی جائیگی اور وہ اس غیر متشدد موت سے خود ہی اپنے وقت پر مرجائیں گے۔ بہرحال حکومت اپنے حکم سے موت کی سزا نہ دیگی بلکہ ان کو قتل کرنے کے باوجود مرنے کے لیے آزاد رہنے دیا جائیگا، یہ نہیں کہ اُن کو بیرحمی کے ساتھ لٹکا دیا جائے اور وہ پھانسی کے پھندے میں اپنی جان دیں اسی طرح وہ سزائیں جو آج کل بعبور دریائے شور کہلاتی ہیں۔ اس وقت تبدیل ہوکر "شور سازی کی صورت اختیار کرلیں گی اور اُن کے ملزموں کو سمندر کے کنارے بھیجدیا جائیگا کہ وہ تمام عمر وہیں رہیں اور نمک بناکر زندگی بسر کریں۔ اول تو سوراجی راج میں اس قسم کے جرائم ہی نہ ہونگے۔ ہر طرف شانتی اور عدم تشدد کا دور دورہ ہوگا۔ لیکن قانون پھر بھی قانون رہیگا اور قانون کی نظر میں ان تمام باتوں کا ہونا ضروری ہوگا خواہ وہ عمل میں یا نہ آئیں۔ یہ ہوگی وہ عدالت اور یہ ہوگا وہ انصاف

جس کو تمھاری غلامانہ ذہنیت سمجھ ہی نہیں سکتی"۔ مہاشہ جی کی اس مفصل نہرو رپورٹ کو بغور سُنا اور اعتراف کے انداز میں عرض کیا "واہ مہاشہ جی کیا بات ہے، واللہ وہ اسکیم پیش کی ہے جو ہمارے تو کیا ہمارے فرشتوں کے بھی ذہن میں نہیں آسکتی تھی۔ بات یہ ہے کہ تم کانگریسی حلقہ سے بہت زیادہ قریب ہوا اور قریب کیا ہو بلکہ خود ہی اُس حلقہ میں ہو اور ہم اُس سے بہت دُور۔ لہٰذا جو تم سمجھ سکتے ہو ہم نہیں سمجھ سکتے"۔ فخریہ انداز میں فرمانے لگے۔ "تو پھر تم خواہ مخواہ دخل در معقولات کیوں کر رہے تھے۔ بھائی یہ تو معمولی سی بات ہے کہ جس سوراج کو حاصل کرنے کے لیے مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل اور پنڈت مدن موہن مالوی ایسے بیرسٹر کوشش کر رہے ہیں۔ اُسکی عدالتوں میں کوئی نقص ہو سکتا ہے؟ تمام دُنیا کی عدالتیں تو خود یہ لوگ چاٹے بیٹھے ہیں۔ انکو کوئی کیا سکھائیگا کہ یہ نہیں وہ"۔ ہم نے طالب علمانہ انداز سے زانوے تلمذ تہ کرتے ہوے عرض کیا "مگر مہاشہ جی یہ عدالتوں وغیرہ کا خرچ کہاں سے نکلے گا۔ مثلاً حاکم عدالت اور عملۂ عدالت کی تنخواہیں اور دوسرے مصارف وغیرہ"

ایک متبحر عالم کی طرح کہنے لگے "ارے میاں وہ تو عدالت کی آمدنی ہی سے سب پورا ہو جائے گا۔ آخر یہ جو جرمانے ہونگے کہاں جائینگے۔ یہ جو اسٹامپ وغیرہ کی قیمتیں ہونگی اُن سے کوئی سرکاری خزانہ بھرنا تو مقصود ہوگا نہیں، بس یہ ہوگا کہ جو مہینہ بھر کی آمدنی ہوئی اس میں سے خرچ نکال لیا جائیگا، باقی منافع اگر بچیگا تو کانگریس فنڈ میں ڈالدیا جائیگا۔ اور وہ بھی سب ہم ہی لوگوں کے کام آئیگا" عرض کیا "مگر سُنیئے تو سہی کہ جب سوراج مل جائیگا تو پھر کانگریس کی کیا ضرورت باقی رہیگی۔ جو وہ قائم رہیگی اور جب وہ قائم نہ رہیگی تو اُس کا فنڈ کیسا؟" تجربہ کارانہ تیور سے فرمایا "واہ یہ بھی ایک ہی رہی کہ کانگریس سوراج کے بعد توڑ دی جائیگی۔ ارے بھائی کانگریس تو اب سے لیکر قیامت تک رہیگی بلکہ شاید اس کے بعد بھی رہے۔ جب انگریزوں کی حکومت اس کو مٹا نہ سکی تو سوراج ملنے کے بعد کیا ہم خود اپنے پیر پر یہ کلہاڑی مارینگے؟ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا بلکہ سوراجی راج دراصل کانگریسی راج ہوگا اور کیوں نہ ہو کانگریس ہی کے بل بوتے پر تو سوراج ملیگا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر کانگریس باقی نہ رہے گی تو ممکن ہے کہ سوراجی راج بھی

بغیر کسی تنبیہ الغافلین جمیعتہ کے انگریزی راج بن جائے اور سارا کیا کرایا برباد ہو جائے۔" ہم نے کہا "ٹھیک کہتے ہو مہاشہ جی مگر یہ تو بتاؤ کہ ــــــــــ"

"رام جس گواہ حاضر ہے، رام جس گواہ حاضر ہے، رام جس"

اس آواز نے احاطۂ عدالت میں گونج کر سارا مزہ کرکرا کر دیا، مہاشہ جی گڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے اور "پکار ہو گئی" کہتے ہوئے بھاگے لیکن بھاگتے ہی پھر کچھ خیال آگیا اور ہماری طرف جھپٹے کہ "لو بھائی یہ میری گاندھی ٹوپی تم پہن لو اور اپنی ترکی ٹوپی مجھ کو دیدو شاید گاندھی ٹوپی دیکھ کر صاحب بُرا مان جائیں۔" ہم نے بغیر کسی پس و پیش کے ٹوپی بدل لی۔ اس لیے کہ تھوڑے دنوں کے بعد ممکن ہے کہ سوراجی حکومت میں ہم کو بھی سودیشی عدالت میں حاضر ہوتے ہوئے ترکی ٹوپی سے مہاشہ جی کی گاندھی ٹوپی بدلنا پڑے۔

گومتی سے جمنا میں

گومتی سے جمنا میں

خدا جانے مجھ کو سفر کی ضرورت تھی یا سفر کو میری بہر حال دونوں میں سے ایک بات برحق تھی اس لیے کہ میں نے خود اپنے کرتا ہی ہوش و حواس سفر میں دیکھا۔ ۱۰ ر نومبر ۱۹۳۰ء کی صبح کو بیدار ہونے کے بعد بھی میرے تخیلات میں وہی دو پہیوں والی بائیسکل تھی میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ بیداری کے اس خواب کی تعبیر ریل گاڑی ہو سکتی ہے۔ لیکن ہوا یہی کہ ٹھیک گیارہ بجے مجھکو اطلاع دی گئی کہ میں رات کی گاڑی سے سفر کرونگا۔ ظاہر ہے کہ اس میں میرے ارادے کو دخل نہ تھا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ بہت سی باتیں غیر ارادی طور پر ہوا کرتی ہیں اور انھی میں سے میرے نزدیک یہ سفر بھی ہے۔ گیارہ بجے کے بعد سے تمام دن دفتر روزنامہ "اودھ اخبار" کی کرسی پہ گذرا

لیکن ایسا ہونے کے باوجود مجھ کو تمام دن یہ محسوس ہوتا رہا کہ گویا میری کرسی ترقی کے منازل طے کر کے ریل گاڑی بن گئی ہے، اور میں نے وہی سفر شروع کر دیا ہے جو میں شروع کرنے والا تھا۔ اس عالم کا نام ہے سفر کا سوار ہونا اور یہی عالم مجھ پر اس وقت تک طاری رہا جب تک میں نے اپنے دن بھر کے تصور کو جاں دار نہیں دیکھا۔ لیکن اسکے بعد گویا مجھ پر وہ تمام کیفیت خود گزر رہی تھی جس پر دن بھر میں گزر چکا تھا۔

چار باغ اسٹیشن سے میرا سفر شروع ہونے والا تھا لہٰذا لکھنؤ کے اسی عظیم الشان "تاج محل" اسٹیشن پر رات کو نو بجے میں اور میرے رفیق سفر جن میں سے تین شاعر ایک شاعر نواز، دو ہولڈال اور تین سوٹ کیس تھے پہونچ گئے اور تیسرے درجہ کے اس ڈبہ میں جگہ پائی جو اب تک "دیسی صاحب بہادروں" کے لیے مخصوص تھا، لیکن اب اسمبلی نے اس خصوصیت کو مٹا دیا ہے۔ البتہ جی، آئی، پی، ریلوے ابھی تک اس "اینگلو انڈین پن" سے باز نہیں آئی۔ اس ڈبے میں بیٹھنے کو تو بیٹھ گئے۔ لیکن دل بار بار یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح

سر کی ترکی ٹوپی ہیٹ بن جائے، اور شیروانی ایک ایسا کوٹ جو پاجامے کو
بھی پتلون بنا دیا کرتا ہے اس لیے کہ اس جسارت کے بعد یہ خوف تو
بہرحال دل میں موجود تھا کہ کہیں اس تھرڈ کلاس کی جنت سے ہم کو
ابن آدم سمجھ کر نکال نہ دیا جائے۔ یہ تو بہت آسان تھا کہ ہم وقتی طور پر
بجائے مسلمان ہونے کے عیسائی بن جاتے لیکن اس لباس کا
کوئی علاج ہمارے ذہن میں نہ تھا جو کبھی مذہب تبدیل نہیں کرتا
ہمارا خوف بیجا نہ تھا اور بیجا کس طرح ہوتا جب کہ ہم خود حق بجانب
نہ تھے نہ تو ہم اینگلو انڈین تھے نہ صرف "اینگلو" بلکہ محض "انڈین"
تھے۔ لہذا حق بجانب بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد گارڈ
نے ہم کو نکل جانے کا حکم دیا، جس کو ہم نے اس طرح سُنا گویا سمجھے نہیں
اور وہ سمجھا کہ ہم سمجھ گئے۔ مگر گاڑی کی روانگی سے دو منٹ قبل ہم کو پھر
اُردو زبان میں نکل جانے کے متعلق سمجھایا گیا جس کو ہم نے سمجھنے کی
کوشش نہیں کی۔ گارڈ صاحب نے بہت سے کرڈمین ہم پر تعینات کیے
کہ وہ ہم کو نکال دیں لیکن ہم نے اسمبلی کے تمام واقعات پر روشنی
ڈالتے ہوئے ایسی مدلل بحث کی کہ گاڑی نے سیٹی دیدی، اس آخری

وقت میں گارڈ صاحب کے دل میں تو نہیں معلوم کہ کون سا انتقامی جذبہ پیدا ہوا ہو گا لیکن اُنھوں نے کیا صرف وہ جو ہم لوگ خود اپنے بچپن میں کیا کرتے تھے یعنی ڈبہ میں داخل ہو کر روشنی گل کر دی، اس ادا پر بہت سے سطحی مسافروں کو تو غصہ آیا ہو گا لیکن میرے مُنہ سے نکل گیا۔

تو مشق ناز کر سارا اندھیرا میرے ڈبے میں

گاڑی چھوٹ چکی تھی ڈبے میں اندھیرا تھا اور سب خاموش کہ ایک منچلا مسافر نے بڑھ کر روشنی جلا دی اور گارڈ کی بربریت پر دانت پیس پیس کر تبصرہ کرنے لگا۔ ہم سب نے اس تبصرہ کو اس حد تک سُنا کہ آخر یہ طے پا گیا کہ کانپور پہونچ کر اس وحشیانہ سلوک کی شکایت کی جائیگی۔ چنانچہ یہی ہوا کہ کانپور پر سب سے پہلے ہماری شکایت اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں داخل دفتر ہو گئی۔

(۲)

لاحول ولا قوۃ، اب تک یہ بھی نہ بتایا کہ آخر ہم کس تقریب سے اور کہاں جا رہے تھے۔ تقریب کے متعلق ہم کو خود کوئی علم نہیں اس لیے کہ اگر تقریب تھی بھی تو ہماری نہ تھی لیکن کہاں جا رہے تھے کے متعلق

آپ یہ سمجھ لیجیے کہ ہر اُس جگہ جہاں لیجائے جائیں اور اُس وقت،
ٹکٹ صرف اٹاوہ تک کا تھا جہاں کہ گاڑی کا بیورو ویٹنگ روم میں پڑے رہنے پڑیں گے،
اور جو اپنی قسم کا درہ خیبر ہے کہ لمبان نسبتاً چوڑان سے اسقدر کم ہے کہ گویا
بس لمبان ہی لمبان ہے اور وہ بھی ایک طرف پلیٹ فارم اور
دوسری طرف سڑک کے حائل ہو جانے سے اس قدر موزوں حدود
میں رہ گئی ہے کہ اگر نہ رہتی تو اچھا تھا۔ ایسے ویٹنگ روم میں ٹھہرنا
اور ٹھہر کر آرام کرنا ممکن ہے کہ کسی قسم کی مخلوق کے بس میں ہو۔
لیکن ہمارے بس کی بات نہ تھی، آرام کرنا اور نہ کرنا تو خیر دوسری چیز
ہے لیکن وقت گزاری تو بہر حال ضروری تھی لہذا ہم نے اپنا
ویٹنگ روم اپنی جماعت کے قائد اعظم کو سمجھا۔ جن کا شریک سفر
ہونا ہی ویٹنگ روم کے آرام سے کہیں زیادہ تھا ہم نے اپنا
اسباب دوسرے مسافروں کے اسباب کے پاس رکھدیا اور خود
اس اسباب پر بیٹھ گئے۔ کوئی گنگنا رہا تھا، کوئی اونگھ رہا تھا۔ کوئی
ٹہل رہا تھا لیکن ہمارے قائد اعظم کو معلوم تھا کہ وہ ہماری جماعت
کے رہنما ہیں اور ان کا کیا فرض ہے۔ انکے علاوہ خود انکے معدہ میں

وہی تکلیف پیدا ہو گئی تھی جس کو اصطلاح عام میں بھوک کہتے ہیں۔
اور ان کا دماغ اس تکلیف کو دور کرنے کی فکر میں مصروف تھا یکایک
ہم سب نے اپنے قائد اعظم کو ڈیٹنگ روم سے نکلتے ہوئے دیکھا اور جب ہم
سب ان کے پیچھے دوڑے تو معلوم ہوا کہ مسبب الاسباب خدا نے کسی
مسافر کے اسباب سے ہمارے لیے شیرینی کا انتظام کیا ہے۔ ہمارے قائد اعظم
کے ہاتھ میں حلوہ سوہن تھا جو کسی مسافر کے سامان سے نکل کر کسی مسافر
کے معدہ میں پناہ چاہتا تھا۔ حلوہ سوہن کے ذائقہ سے کہیں زیادہ اس
نعمت کے غیبی طور پر حاصل ہو جانے سے لطف آ رہا تھا اور خود حلوہ سوہن
بھی ایسا تھا کہ سبحان اللہ کا نپور میں دلی اور آگرہ کا مزہ آ گیا معلوم نہیں
خریدنے والے نے کس جگہ اور کس حساب سے خریدا تھا لیکن کھانے والوں
نے تو اس طرح کھایا گویا آسمان سے نازل ہو کر معدہ میں پہنچ گیا ہے۔
خیر ان باتوں سے کیا مطلب؟ ہم نے تو خدا کا شکر ادا کیا اور قائد اعظم کو
دعائیں دیں۔ اس میں شک نہیں کہ "صاحب حلوہ سوہن" نے جو
ان کے ہاتھوں "مرحوم حلوہ سوہن" بن گیا تھا۔ چرانے والے کو خوب ہی
کوسا ہو گا لیکن یا اب اجابت پر پہنچ کر ہماری دعا اور اس کی بددعا کا

تصادم جو نتیجہ برآمد کریگا، وہ کچھ نہیں ہوگا یعنی، ع

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

حلوہ سوہن کھانے کو ملا اور بغیر کسی جانی یا مالی نقصان کے یہی
کیا کم تھا۔ اٹاوہ جانے والی گاڑی اس "حلوہ سوہنی ہنگامہ" کے بعد
آکر ہم کو لے گئی اور ہم سب ایک ڈبہ میں بیٹھکر روانہ ہوئے جس میں بھانت
بھانت کے افسانوں کے علاوہ "بہرسہ" نہ سہی لیکن "بپاس نگاہ"
کا سامان موجود تھا۔ جس نے ہمارے شریک سفر حضرت امین سلونوی کو
اس حد تک جذب کیا کہ ہم سب کی اجتماعی کشش اُن کو اس سیٹ سے
بمشکل ہٹا سکی جس پر راجپوتانہ کے شباب مگر معصوم حسن کا ایک نمونہ بطور
نمونہ مع اپنے دوکاندار کے موجود تھا۔ امین صاحب کے ہٹ جانے کے بعد
وہ جوان راجپوتنی شیر کی کھال اوڑھ کر ایک مست شیرنی کی طرح اس
انداز سے شباب کی نیند میں کھو گئی کہ پھر ہمارے امین صاحب کو ادھر
دیکھنے کی جرأت بھی نہ ہوتی کہ مبادا پنجہ مار دے لیکن پھر بھی ان کا دل
یہی چاہتا تھا کہ میں راجپوت ہوتا بلکہ اگر وہ کسی راجپوت کی دھرم پتنی
نہ ہو گئی ہوتی تو ہمارے لائق دوست اُسکے پتی بن جانے کو امین سلونوی

ہونے پر ترجیح دیتے، تمام راستہ اُنکی یہی آرزو رہی کہ کسی طرح پشر کی کھال ہٹ جائے اور وہ نظر بھر کر اس شیرنی کو دیکھ لیں لیکن وائے ناکامی کہ اٹاوہ سے پہلے دہ کا فرشیرنی والا جلوہ نظر نہ آیا۔ اور اٹاوہ کے اسٹیشن پر نظر بھی آیا تو اس طرح کہ وہ انگڑائی لے رہی تھی اور گاڑی چھوٹ کر تیز ہو چکی تھی لیکن اس کا قصور اٹاوہ کے پلیٹ فارم پر امین صاحب کے دل میں یا دماغ میں جہاں بھی ہو بہرحال موجود تھا یا وہ خود اٹاوہ کے پلیٹ فارم پر ہونے کے باوجود ابھی تک اُسی گاڑی میں تھے جس سے اُتر چکے تھے۔

اٹاوہ کے پلیٹ فارم پر اُترنے کا مقصد اشفاق حسین صاحب بیخود اٹاوی سے ملنا تھا، جس کا آدھی رات کو کوئی موقعہ نہ تھا، یا اگر تھا تو خطرہ سے خالی نہ تھا، لہٰذا ہم سب چُپ ہو کر سو رہے اور اُس وقت تک سوتے رہے جب تک ہمارے قائداعظم نے بستر پر بیا کا نہ چڑھ آنے والے کُتّے کو نہایت صور نما آواز سے ڈانٹا نہیں جس سے کُتا تو خیر بھاگ گیا لیکن ہم لوگ جو موت سے شرط باندھ کر سوئے ہوئے تھے گڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے اور بیخود صاحب کے یہاں جانے کے لیے تیار ہو گئے تیاری میں کیا دیر لگتی ہے۔ یہ سمجھیے کہ بیخود صاحب کے در دولت پر پہونچ گئے

بیخود صاحب علیگڈھ کالج کے تعلیم یافتہ وکیل اور اٹاوہ کے رہنے والے شاعر
ہیں مختصر یہ کہ شاعر بھی ہیں اور وکیل بھی، خدا جانے کہ وکیل اچھے ہیں یا
شاعر اچھے۔ اس لیے کہ اب تک کسی مقدمہ میں ہم نے اُن سے وکالت نامہ
داخل نہیں کرایا ہے اور نہ کبھی اُن کی کوئی بحث یا جرح سُنی ہے لیکن
جہاں تک شاعری کا تعلق ہے صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے پہونچنے پر
بیخود صاحب نے تعزیرات ہند بند کر کے بغیر اپنی بیاض کھولے ہوئے ہلکے ہلکے
سُروں میں اپنی چند غزلیں سُنا دیں جو خوب یا دھتیں اور غزلوں سے کہیں
زیادہ اُن کا وہ ترنم لطیف تھا جسکی لچک سے سُننے والے ایک خاص لطف
حاصل کر رہے تھے۔ بیخود صاحب کے بعد خاکسار ذرہ بمقدار کمال صاحب
حامدی، اور آیین صاحب سلدنوی نے اپنا کلام سُنایا، اور رخصت ہو کر
بعجلت پان وغیرہ پیے ہوے اسٹیشن آ گئے، جہاں ہولڈال پر اپنے قائد اعظم کو
اس لیے بٹھا گئے تھے کہ اسباب دیکھتے رہیں۔ بیخود صاحب نے ہم لوگوں کو
رخصت کرنے سے قبل اٹاوہ کے مشاعرہ کی شرکت کے لیے دعوت نامے
دیے تھے جن کو ہم نے غلطی سے اسٹیشن پہونچ کر بجنسہ لیٹر بکس میں ڈال دیا
افسوس ہے کہ وہ کارڈ بیخود صاحب کو بیرنگ واپس ملیں گے اور خواہ مخواہ

چار یا پانچ آنے اُن بیچارے کو دینا پڑینگے۔

اٹاوہ سے ہم نے آگرہ ٹکٹ خریدا اور "بسفر رفتند مبارکباد" ہوگئے ہمارا ڈبہ بالکل خالی تھا یعنی ہماری جماعت کے علاوہ صرف ایک اور مسافر تھا جو بیچارہ اپنی ایک آنکھ لیے ہوئے ایک گوشہ میں بیٹھا گنگنا رہا تھا۔ ہم لوگ نہایت اطمینان سے بیٹھ گئے اور ہمارے قائداعظم لیٹ گئے سونے کے لیے تو ہم سب کا دل چاہتا تھا لیکن اس خیال سے کہ سوکر سفر طے کرنا عمر عزیز کو خواب غفلت میں گزارنے سے بھی بُرا ہے۔ ہم سب جاگتے رہے۔ البتہ قائداعظم نے خراٹے لینا شروع کر دیے۔ ایک طرف اُن حضرت کے خراٹے، اور دوسری طرف اُس تنہا یک چشم مسافر کا سامعہ خراش ترنم ریل کی چھکا چھک پر غالب آکر ہمارا دماغ اُڑائے دیتا تھا۔ نہ تو قائداعظم کے خراٹوں پر دفعہ ایک سو چالیس لگائی جا سکتی تھی اور نہ اُس مسافر کی نغمہ سرائیوں کو خلاف قانون جماعت بنایا جا سکتا تھا۔ عجیب مصیبت میں تھے۔ میں نے مجبوراً اُس مسافر سے کہا کہ آپ ذرا آہستہ گنگنائیں۔ بولا۔ "کیوں؟" عرض کیا کہ "ہم سب ان سونے والے بزرگ کو آگرہ لیے جا رہے ہیں۔ تین سال سے دماغ میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ بات

کرتے کرتے منھ نوچ لیا کرتے ہیں۔ جس کسی کو دل چاہتا ہے اٹھا کر دے مارتے ہیں، یا کسی کو کاٹ کھاتے ہیں اور کسی کو گالیاں دیتے ہیں مجبوراً ہم سب اپنے دل پر پتھر رکھ کر انھیں آگرہ کے پاگل خانہ میں داخل کرنے جا رہے ہیں۔ آپ سے اس لیے کہدیا کہ کہیں آپ پر حملہ نہ کر بیٹھیں۔ یہ سُننا تھا کہ مسافر کی روح پرواز کر گئی، چپکے سے اپنا بستر اُٹھا کر پاخانہ کے قریب جبیھ گیا۔ غالباً اُس نے یہ طے کیا ہوگا کہ اگر پاگل نے حملہ کیا تو پاخانہ میں گھُس کر جان بچا لونگا۔ اس کے جگہ منتقل کرتے ہی مفروضہ پاگل نے انگڑائی لی اور میں نے دوڑ کر سنبھالتے ہوئے کان میں تمام واقعہ کہدیا بس پھر کیا تھا وہ بڈھا پاگل اپنی سیاہ اور سفید منتشر داڑھی کو سُرخ چہرے کے ساتھ لیے نہایت خوفناک طریقہ پر اُٹھا اور بھیانک آواز میں پوچھا۔

”بھوپال کتنی دُور ہے“

چونکہ رُخ اُسی سہمے ہوئے مسافر کی طرف تھا لہٰذا اُس نے جواب دیا۔

”اب آتا ہے تھوڑی دُور ہے۔ آپ لیٹ جائیے“

مسافر کے جواب پر پاگل صاحب اسی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور اس سے اس طرح گفتگو شروع کی کہ اس بیچارے کا خون بالکل منجمد ہو گیا

وہ مجبور تھا کہ گاڑی چل رہی تھی ورنہ شاید وہ اس طرح سہم سہم کر کبھی جان نہ دیتا۔ پاگل نے اس سے پوچھا کہ "تم کون لوگ ہو" اُس نے جواب دیا "برہمن" یہ سُننا تھا کہ پاگل نے فوراً اپنا لوٹا اُٹھا کر اس سے پوچھا "پانی پیو گے" اُس نے لرزتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں صاحب آپ تو سو جائیے" پاگل نے کہا "نہیں ضرور پیو" اور یہ کہہ کر لوٹے کا تمام پانی اس پر چھوڑ دیا۔ وہ بیچارہ بھیگ جانے کے باوجود اس طرح خاموش بیٹھا تھا گویا اگر جان بخش دی جائے تو یہ سب کچھ منظور ہے لیکن یہاں تو اسکی روح قبض کی جا رہی تھی ہمارے پاگل قائد اعظم نے داڑھی پر متانت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا:۔

"ہم اچھے ہیں نا؟"

مسافر نے درباریوں کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔ ہاں صاحب بالکل اچھے۔ پاگل نے کہا "مگر سب ہم کو پاگل کہتے ہیں۔ یہ سب لوگ ہم کو زہر دینا چاہتے ہیں، تم بڑے اچھے ہو، ہم کو اچھا کہتے ہو"

یہ کہہ کر اُسکی طرف بڑھے اور اُس کے پیر پکڑ کر دبانا شروع کر دیے اُس وقت اگر مسافر کی حرکت قلب کو دیکھ کر اُس کے اختلاج کا اندازہ کیا جاتا

تو غالباً ڈاکٹر اور حکیم اس کو مرنے کے قریب سمجھتے لیکن بیچارہ اپنی سانس روکے ہوئے بیٹھا تھا کہ جو قسمت میں لکھا ہے ہو کر رہیگا، خدا نے اُسکی مشکل آسان کر دی اور ٹونڈلہ اسٹیشن آجانے سے اُس کی جان میں جان آگئی، گاڑی کے ٹھہرتے ہی ایسا غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ہم لوگ ٹونڈلہ سے آگرہ جانے والی گاڑی پر روانہ ہو کر آگرہ پہونچے، اور اسٹیشن سے سیب بازار کے ایک ہوٹل میں پہونچ کر اپنا سامان رکھدیا۔ آگرہ میں حضرت فانی بدایونی، مولانا سیماب صدیقی، حضرت ساغر نظامی، اور حضرت مانی جائسی سے ملنا تھا۔ لہذا سب سے پہلے فانی صاحب کی تلاش شروع ہوئی۔ اس لیے کہ ساغر صاحب کے آگرہ میں موجود ہونیکا شبہہ بھی نہ تھا، اور سیماب صاحب کے متعلق یقین تھا کہ اگر اُن سے ملے تو پھر وہ گرفتار کرکے رہا کرنا بھول جائینگے۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ تمام آگرہ سے چھٹی کرکے سیماب صاحب سے ملا جائے، تاکہ اگر وہ گرفتار بھی کرلیں تو کوئی پروانہ ہو۔ فانی صاحب کا مکان اس طرح ڈھونڈھا گیا کہ اگر خدا کو ڈھونڈھا جاتا تو مل جاتا لیکن وہ ملنا تھا نہ ملے۔ آخر کار مجبور ہو کر ہمارے قائدِ اعظم نے ایک اہیر کو پکڑ لیا اور

فانی صاحب کا پتہ پوچھا، بھی اُس کو نہ چھوڑا بلکہ رات کو دس بجے تک اپنے ساتھ رکھا وہ شخص بھی اپنے گھر کا فالتو معلوم ہوتا تھا، کہ بلاوجہ ہمارے ساتھ ساتھ رہا، بلکہ ہم کو تو قائدِ اعظم اور اُس اجنبی کے فوراً پیدا ہو جانے والے گہرے تعلقات دیکھ کر دال میں کچھ کالا کالا نظر آنے لگا اور ہمارا یہ شبہ بیجا بھی نہ تھا اِس لیے کہ وہ صاحب جس حد تک مسافر نواز تھے اُسی حد تک ہمارے قائدِ اعظم بے تکلف لیکن خدا کا شکر ہے کہ کوئی ناگفتہ بہ قسم کی واردات نہیں ہوئی۔ ہاں تو اُن خضر اکبر آبادی کی مدد سے ہم سب حضرت فانی بدایونی کے در دولت پر پہونچے اور فانی صاحب سے مل کر اُن کا کلام سنا، اپنا کلام سنایا۔ اور دوسرے دن حاضر ہونے کا وعدہ کر کے اس انداز سے لوٹ آئے کہ اب تو گھر دیکھ ہی لیا ہے۔ فانی صاحب کے یہاں سے واپسی پر ہمارا قافلہ نائی کی منڈی پہونچا جہاں قصر الادب مقفل تھا لیکن ہم کو راستہ ہی میں اپنے قیس صفت دوست تبسم نظامی سے معلوم ہو چکا تھا کہ سیماب صاحب تو آگرہ سے باہر ہیں لیکن ساغر صاحب آگرہ کے اندر ہیں۔ لہٰذا ہم قصر الادب کے قفل کو دیکھ کر مایوس نہیں ہوئے بلکہ سیدھے سیماب صاحب کے درِ دولت پر حاضر ہوئے جہاں آواز دیتے ہی ہماری اُمیدیں

اس طرح پوری ہوئیں کہ بابِ اجابت سے وہ شخص برآمد ہوا جس کو دنیا تو
خیام العصر خالقِ جذبات حضرت ساغر نظامی علیگ مدیر پیمانہ و مستقل
و استقلال و مصنف نہیں معلوم کیا کیا کہتی ہے۔ لیکن یہ خاکسار ذرا
گستاخی سے حضرت ساغر یا بہت پیار آیا تو شریر ساغر کہتا ہے۔ ساغر
مجھ کو اور میں ساغر کو اس طرح دیکھ رہے تھے کہ گویا اب کی کسی عظیم الشان
دنگل میں ہم دونوں کی کشتی ہے لیکن یہ کیفیت باقی رہنے والی نہ تھی
لہذا نہ رہی اور ہم دونوں اس طرح بغلگیر ہوگئے گویا توام پیدا ہوئے تھے،
یہ معانقہ تو تھا وہ جس پر کیوپڈ اپنی نورانی جھنڈی ہلاتا ہے۔ اسکے بعد
ساغر صاحب نے جتنے معانقے فرمائے وہ سب ایسے تھے کہ "چہ دشمن
چہ دوست"۔ منظر صاحب سے ملے، اعجاز سلمہٗ سے ملے۔ سجاد میاں سے
ملے۔ یہ سب اور ایک ان سے چھوٹے سیماب صاحب کے حسب مراتب
صاحبزادے ہیں۔ سیماب صاحب کے مکان سے باتیں کرتے اور شکوے
شکایتیں کرتے ہوئے ہم سب قصر الادب پہونچے جو ہمارے لیے خالی کیا گیا
تھا، یہاں پہونچنے پر ساغر صاحب کو لاحول ولاقوۃ ساغر کو ہمارا سامان
نہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ تعجب ہوا۔ غصہ آیا۔ رنج ہوا۔ اور آخر آنکھوں نے

جواب طلب کر ہی لیا۔ بلکہ فوراً ہم کو ہوٹل بھیجکر تمام سامان منگا لیا۔
یہ سب کچھ میں پہلے ہی جانتا تھا لیکن کیا کرتا اگر میں ہوتا تو ایسی
غلطی کرتا بھی نہیں ستم یہ تھا کہ بجائے میں کے ہم تھے بہرحال ہوا وہی
جس کا مجھے یقین تھا کہ سب قصر الادب میں مہمان ہو گئے۔ جہاں
خلوص اوڑھا جاتا ہے خلوص بچھایا جاتا ہے۔ خلوص کھایا جاتا ہے
اور خلوص پیا جاتا ہے۔ رات کے اس وقت جس کو آدھی رات
کہتے ہیں۔ شاعری اور شاعری بھی ساغر کی شاعری، منظر کی
شاعری، اعجاز کی شاعری ہوتی رہی۔ اسکے بعد ہم سب سو گئے۔
صبح بیدار ہوے تو مولانا سیماب صدیقی اخبار "تاج" کی کرسی ادارت
پر بیٹھے ہوے کام کر رہے تھے، اب تک تو خیر ہم کو شبہ تھا لیکن اب
یقین ہو گیا کہ مولانا سیماب بجائے چار کے پانچ چھ عناصر سے مرکب
ہیں یعنی غور تو فرمائیے کہ آدھی رات کے بعد جو شخص طول وطویل سفر سے
واپس آیا ہو وہ صبح تڑکے اخبار کا کام کس طرح کر سکتا ہے لیکن جناب
ان کو ہم نے اب تک تو بگوش خود سنا تھا لیکن اب بچشم خود دیکھ بھی لیا کہ
تمام دن اسی طرح کام کرتے رہے اگر ہم خدانخواستہ اتنا کام کریں تو

تھوڑے ہی دنوں میں یا تو مرجائیں ورنہ بجائے انسان کے خدا جانے
کیا ہو جائیں۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ دُنیا ایسے ہی لوگوں پر قائم ہے
یہ لوگ دراصل انسان تھوڑی ہیں دُنیا کو قائم رکھنے کے لیے کھمبے ہیں۔
مولانا سیماب اپنے کام میں مصروف تھے اور ہماری تواضع میں بھی
اس کے بعد بھی معلوم ہوتا تھا کہ گویا کوئی بات ہی نہیں ہے۔

چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم سب فانی صاحب اور مانی صاحب سے
ملنے گئے اور وہاں سے واپسی پر سیماب صاحب کے یہاں لذیذ ما حضر تناول
فرمایا۔ کھانے میں غیر معمولی جلدی کی اس لیے کہ اس کے بعد دُنیا کے
سات عجائبات میں سے ایک کو دیکھنے کی باری تھی لہٰذا کھانا کھا کر
ہم سب ساغر کے ہمراہ تاج محل پہونچے۔ یہ وقت اگر حاصل زندگی کہا جائے
تو غلط نہ ہوگا۔ اس لیے کہ حاصل ہندوستان ہمارے پیش نظر تھا۔ کیا
عرض کیا جائے کہ ساغر اور مولانا سیماب نے تاج محل نمبر میں اس کے
متعلق سب کچھ لکھ دیا ہے ورنہ کم از کم یہ ضرور عرض کرتا کہ ممتاز محل ایک
عورت کی شکل میں دفن ہوئی تھی اور عمارت بن کر نمایاں ہو گئی۔ ؎

سب کہاں کچھ تاج بنکر پھر نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

معلوم ہوتا ہے کہ ممتاز محل کا بیج جمنا کے کنارے بویا گیا اس سے جو درخت نکلا ہے وہ تاج محل ہے۔ تاج محل کو دیکھکر معلوم نہیں کس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ ہماری آنکھیں تو بند ہوئی جاتی تھیں۔ اچھا ایک بات ہے کہ اگر سوراج مل جانے کے بعد تاج محل ہم کو سکونت اختیار کرنے کے لیے دیدیا جائے تو ہم آج ہی قومی تحریک میں دامے، درمے، قدمے، سخنے، شریک ہونے کو تیار ہیں لیکن مہاتما گاندھی تحریری وعدہ کریں، گو ہم جانتے ہیں کہ یہ وعدہ کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے خود انگریز ہندوستان کو محض اس لیے نہیں چھوڑتے کہ تاج محل اُنکے قبضہ سے نکل جائے گا۔ اگر تاج محل کو کسی طرح انگلستان کے بکھنگم پیلس میں پہونچا دیا جائے تو آج ہی سوراج ملا جاتا ہے لیکن اس کو انگلستان پہونچانے میں بھی بڑی بڑی دقتیں ہیں۔ ورنہ یہ انگریز تاج محل کو کبھی آگرہ میں نہ رہنے دیتے۔ تاج محل کے متعلق صرف یہی کہدینا کافی ہے کہ اس کی تعمیر کے بعد خداوند کریم کو جنت کا معیار بلند کرنے کی فکر ہوئی ہوگی۔

تاج محل کی سیر کے بعد ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا کہ اُسکے مینار پر چڑھ کر لہراتی ہوئی جمنا کا اور اپنی گومتی کا موازنہ کریں۔ لیکن جب

مینار پر پہونچکر ہم نے جمنا کو دیکھنا چاہا تو سر چکرا گیا اور معلوم ہونے لگا کہ گومتی کا پانی جمنا میں گرا ہی چاہتا ہے۔ ساغر اور آئین کا خدا جانے کیا حال تھا، لیکن یہاں تو خدا کے گھر سے قریب تر ہو کر اول کلمۂ طیب ورد زبان تھا، خدا خدا کر کے وہاں سے واپس آئے اور سمجھے کہ خدا کے گھر سے پھرے ہیں۔ یہ مینار صاحب بھی قطب مینار کے برادر عزیز معلوم ہوتے ہیں کہ مرنے کے لیے وہاں سے گرنا ضروری نہیں ہے بلکہ وہاں چڑھ جانا ہی کافی ہے۔

تاج محل سے واپسی پر ہمارے میزبان ہمارے محافظ تھے اور ہم اس طرح "گومتی سے جمنا میں" لکھ رہے تھے، گویا اسکول میں بیٹھے ہوئے حساب لگا رہے ہیں۔ یہ سب اُس ساغر کی عنایتیں تھیں جو تاج محل سے بھی زیادہ مجھکو عزیز ہے۔ اور جس کو میں تاج محل کے عوض بھی اپنے دل سے نکال کر کسی کو نہیں دے سکتا مضمون ختم ہونے کے بعد غالباً ہم واپس ہی ہو گئے تھے یعنی،

"جمنا سے گومتی میں"

مٹھو
بیٹے

مِٹھّو بیٹے
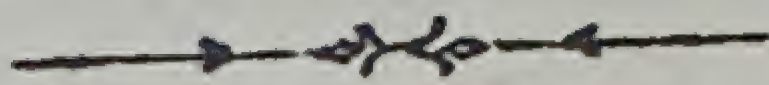
"ہیرا من طوطے کا بچّہ"

یہ تھی وہ آواز جو گرمیوں کی چلچلاتی دوپہر میں لُو کے جھونکوں کے ساتھ بیگم صاحبہ کے کان تک پہونچی اور وہ پنکھا جھلنا چھوڑ کر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں پہلے تو ہماری طرف دیکھا لیکن ہم پہلے ہی سمجھ گئے تھے کہ یہ ہونے والا ہے اور ہم سے کہا جائیگا کہ اس دھوپ میں نکل کر طوطے والے کو بُلائیں لہٰذا ہماری آنکھیں اُن کو بند ملیں آخر بیچاری نے گلشن کو بُلا کر طوطے والے کو بُلانے کی ڈیوٹی سپرد کر دی کہ

"دیکھ میری گلشن کہیں طوطے والا نکل نہ جائے۔ لپک کے بُلا لے۔"

گلشن کی ایک ہی آواز پر طوطے والا گویا گھڑی پر موجود تھا، اور طوطے کے بچے دکھانے کے لیے گلشن کے ہاتھ میں ایک دو تین چار پانچ غرضکہ دس جگہ

طوطے کے بچے بیگم صاحبہ کو پسند کرانے کے لئے بھیجے جانے لگے جن میں سے ایک آدھ پر دام بھی لگا لے گئے لیکن آخر میں تھوڑی دیر کی بحث اور بچہ آنہ کی بار اس تھیں کے بعد ایک بے بال و پر ڈراونی شکل کا بچہ سات آنہ میں خرید لیا گیا، اور دام لیکر طوطے والا رخصت ہوا۔ اب ہم بھی بیدار ہو چکے تھے یعنی ہم نے اپنی مصلحتاً بند کر لینے والی آنکھیں کھول دی تھیں۔ ہم کو بھی وہ طوطے کا بچہ اس شوق کے ساتھ دکھایا گیا گویا ہونہار اولاد دکھائی جا رہی ہے لیکن ہم نے اُس طوطے کے بچے کو ہاتھ میں تو خیر لیا ہی نہیں اور دیکھا بھی تو نفرت کی نظروں سے وہ گوشت کی ایک بے تکی سی بوٹی معلوم ہوتا تھا لیکن جب بغور دیکھا تو اور ہی کچھ پایا، طوطا تو خیر وہ کسی طرح معلوم ہی نہ ہوتا تھا۔ البتہ اُس کو چھوٹی قسم کے اونٹ کا بچہ کہا جا سکتا تھا، وہی لمبے لمبے پیر تھے وہی لمبی سی گردن پر رکھا ہوا ہانڈی نما سر وہی لٹکا ہوا پوٹا اور وہی کوہان کی جگہ پر بے پر کے بازو۔ چونچ تو خیر تھی لیکن دُم وغیرہ کا پتہ نہ چلتا تھا مختصر یہ کہ دیکھکر سخت متلی آئی۔ مگر کچھ نہ کہہ سکے کہ بیگم صاحبہ کو بُرا معلوم ہوگا وہ تو کس شوق سے طوطے کے بچہ کو گود لے رہی ہیں اور ہم اسکے متعلق نفرت کا اظہار کریں

لہٰذا یہی کہہ کر رہ گئے۔

"ابھی بہت چھوٹا ہے کہیں مر نہ جائے۔"

لیکن بیگم صاحبہ کو یہ بھی بُرا معلوم ہوا اور وہ ذرا بگڑ کر بولیں:۔

"خدا نہ کرے وہ مرے، مرنے کیوں لگا وہ تو بڑا اچھا نکلے گا۔۔ دیکھ تب لیجیے گا۔"

ہم۔ "ظاہر ہے۔"

وہ۔ "ظاہر کیا ہے ذرا بڑھنے دیجیے پھر دیکھیے کیسا فر فر بولتا ہے۔ آپ اس کے لیے کل ایک خوبصورت سا پنجرہ اور دو چھوٹی چھوٹی پیالیاں لا دیجیے گا۔"

ہم نے ہاں ہوں کر کے بات ٹال دی کہ اب اگر زیادہ گفتگو ہوئی تو طوطے کے لیے موٹر اور بائیسکل وغیرہ کی بھی فرمائش ہو جائے گی اور اپنے دوسرے کاموں میں لگ گئے۔ بیگم صاحبہ بھی اپنے طوطے کا بچہ لیکر گھر بھر کو دکھانے کے لیے ہمارے پاس سے چلی گئیں اور اس کے بعد سے ہم نے اُن کی تمام تر توجہ طوطے کے بچہ کی طرف دیکھی۔ پہلے تو اس گوشت کی بوٹی کو زندہ رکھنے کی تدابیر ایک مستقل شغل کی حیثیت رکھتی تھیں لیکن

جب خدا نے وہ دن دکھایا کہ اُسکے پر بھی نکل آئے اور وہ طوطے کی شکل کا ہو گیا تو اُس کی تعلیم و تربیت کی فکر بیگم صاحبہ کو چین نہ لینے دیتی تھی، اور بیگم صاحبہ کے علاوہ خود ہمارا ناک میں دَم تھا جب دیکھیے وہ تو پنجرا سامنے رکھے سبق پڑھا رہی ہیں اور ہم ہیں کہ ہمارے دماغ میں اوّل تو کچھ آتا ہی نہیں اور اگر آیا بھی تو طوطے کے سبق کے ساتھ فوراً نکل گیا۔ بار ہا ایسا ہوا کہ قلم لیے بیٹھے ہیں اور کچھ لکھنے کا ارادہ ہے لیکن بیگم صاحبہ کی چر چر اور طوطے کی ٹیں ٹیں دماغ میں گونج رہی ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھیں بمشکل تمام زبردستی لکھنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ بیگم صاحبہ کی آواز اور اُن کے شاگرد رشید کی ٹیں ٹیں اس ارادے کو بھی لے اُڑی۔ آخر ہم نے قلم ہاتھ سے رکھدیا۔ اور اس درس تدریس کو دیکھنے لگے۔

بیگم صاحبہ۔ "چُچ چُچ۔ مٹھو بیٹے، بتی جی بھیجو، مددا اللہ کی"

مٹھو بیٹے۔ "ٹیں، ٹیں ٹیں"

بیگم صاحبہ۔ "حق اللہ پاک ذات، اللہ پاک نبی رسول اللہ۔ بولو"

مٹھو بیٹے۔ چُچ چُچ۔

مٹھو بیٹے۔ "ٹیں ——— ٹیں"

بیگم صاحبہ۔ "بیوی کا پیارا پیارا مٹھو ہے۔ مٹھو بیٹا ہے۔ پچ پچ،
"پانی پیو تو یاد کرو پیاس امام کی"
بولو مٹھو بیٹے"۔
مٹھو بیٹے۔ ———— "
بیگم صاحبہ۔ "شہید وحدا خدا کا رسول، غافل نہ ہو خدا کو نہ بھول، بندے اللہ کے اُمّت رسول۔ بولو مٹھو بیٹے، پچ پچ"۔
مٹھو بیٹے "ٹیں۔ٹیں۔ٹیں۔ٹیں"۔
بیگم صاحبہ۔ "پیر فقیر اُٹھا بستر چل مکہ کی زیارت کو، پیر علی مرتضیٰ مدد۔ بولو، مٹھو بیوی کے پیارے مٹھو، میاں کے دُلارے مٹھو"۔
مٹھو بیٹے۔ "ٹیں ٹیں ٹیں ٹیں۔ٹیں ٹیں ٹیں ———— ٹیں ٹیں"۔
بیگم صاحبہ۔ "بولو مٹھو بیٹے۔ نبی جی بھیجو۔ پیا سو سبیل ہے یہ شہیدِ کربل کے نام کی اور پانی پیو تو یاد کرو پیاس امام کی۔ مٹھو بولو"۔

اب بتائیے کہ ایسی حالت میں ہمارا دماغ کس کام کا رہ سکتا تھا اور ہمارے ذہن میں سوائے اس کے اور کیا آسکتا تھا کہ "مٹھو بیٹے، نبی جی بھیجو مدد اللہ کی"۔ مٹھو بیٹے تو خیر کیا سیکھتے البتہ ہم سوائے "نبی جی

بھیجو" کے سب کچھ بھول گئے اور واقعی جب دن رات مٹھو بیٹے کے ساتھ ہم کو یہ سبق پڑھایا جاتا تھا۔ تو ہم اب تک یہ سبق یاد نہ کرتے بلکہ ہم کو تو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ ہم خود مٹھو بیٹے ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ تو کہیے کہ مٹھو بیٹے صاحب کچھ ایسے کند ذہن واقع ہوئے تھے کہ اُن کو سبق ہی یاد نہ ہوتا تھا۔ اور وہ بس "ٹیں، ٹیں" کر کے رہ جاتے تھے۔ ورنہ ایک مرتبہ تو بیگم صاحبہ ان کو سبق پڑھاتیں اور دس مرتبہ وہ سبق سُنا کر ہمارے رہے سہے دماغ کو خراب کرتے پھر بھی صرف اُن کی "ٹیں ٹیں" آپ کی دعا سے اتنا اثر ضرور رکھتی تھی کہ ہر مرتبہ کان کے پردے پھاڑتی ہوئی دماغ میں گونجتی تھی۔ اور دماغ میں گونج کر دماغ سے پار ہو جایا کرتی تھی خصوصیت کے ساتھ اُس وقت جب کوئی پنجرے پر ہاتھ رکھتا تھا یا اُن کے خاصہ کی پیالیاں نکالنے کے لیے پنجرے میں ہاتھ ڈالا جاتا تھا اُس وقت تو بس کچھ نہ پوچھیے۔ معلوم ہوتا تھا کہ قیامت آگئی ہے اور صور پھونکا جا رہا ہے۔ ایک طرف تو وہ اپنے پر پھڑپھڑا کر پنجرے سے زمین اور آسمان کو ایک کر دیتے تھے۔ اور دوسری طرف اُن کی مسلسل "ٹیں ٹیں" ہمارے دماغ کو اُلٹ پلٹ کر رکھ دیتی تھی۔ یہ تو گویا

اُن کی ناسمجھی اور نادانی یعنی بچپن کا دور تھا لیکن جب وہ نام خدا جوان ہو گئے اور بُرے بھلے کی تمیز کرنے لگے تو اور آفت آئی۔ اب تو نیولے کا دکھائی دے جانا بلّی کا نظر آنا یہ سب مصیبت ہو گیا۔ بلّی کو دیکھکر تو وہ اس طرح چیختے تھے کہ گویا یہ آخری مرتبہ چیخ رہے ہیں اور اس کے بعد اُن کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جانا ہے لہذا پورا زور صرف کر رہے ہیں اور پھر لُطف یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ چیختے تھے اور دوسری طرف بیگم صاحبہ اپنا ضروری سے ضروری کام چھوڑ کر "بل بل بل" کہتی ہوئی دوڑتی تھیں۔ ہزار مرتبہ کہا کہ تم خواہ مخواہ دوڑتی ہو کہیں پنجرے سے بلّی طوطے کو نکال بھی سکتی ہے لیکن اُن کو تو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں بلّی کو دیکھکر اُن کے طوطے کا ننھا سا کلیجہ دہل نہ جائے۔ اسی بلّی سے بچانے کے واسطے جو احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی تھیں وہ ضرورت سے بھی کچھ زیادہ تھیں ایک تو پنجرہ خود ایسا تھا کہ اس میں بلّی کا گزر نا ممکن پھر دن بھر وہ پنجرہ بیگم صاحبہ کے دم کے ساتھ رہتا تھا اور رات کو زمین سے چھ فٹ بلند ٹانگ دیا جاتا تھا کہ بس بلّی کی نظریں تو جا سکیں لیکن وہ خود نہ پہونچ سکے اور نظروں سے بچانے کے لیے بھی پنجرے پر ایک غلاف تھا

مختصر یہ کہ بیگم صاحبہ نے اپنے نزدیک بلّی تو بلّی مٹھو میٹے کو ملک الموت سے بھی بچانے کا پورا پورا انتظام کر لیا تھا۔ لیکن اس قسم کی باتیں اللہ میاں کو بُری معلوم ہوتی ہیں۔ آخر ایک رات جبکہ سارا گھر گہری نیند کے خراٹے لے رہا تھا ایک دھماکے کی آواز کے ساتھ مٹھو میٹے کی "ٹیں ٹیں" نے سب کو گڑبڑا کر اُٹھا دیا اور اُسی کے ساتھ بیگم صاحبہ کی آواز "ہائے میرا مٹھو، ہائے میرا طوطا" تو شاید گھر سے نکل کر محلہ والوں کو بھی جگا دینے کے لیے کافی تھی، ہم آنکھیں ملتے ہوئے بوکھلائے ہوئے پنجرے کی طرف دوڑے دل کی حرکت تو ویسے ہی بڑھی ہوئی تھی اُس پر سے بیگم صاحبہ اور ہاتھ پیر پھلائے دیتی تھیں، ہم بلّی کا تعاقب بھی کر رہے تھے اور بیگم صاحبہ سے کہتے بھی جاتے تھے کہ "ٹھہرو بھی، ذرا صبر کرو، چُپ تو رہو" لیکن وہ تھیں کہ بے قابو ہوئی جاتی تھیں۔

"ارے اب کیوں دوڑ رہے ہو، کمبخت نے میرے مٹھو کو چبا ہی ڈالا ہوگا۔ اللہ کرے اسکو بھی اسی طرح موت آئے۔ ارے میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ اگر مٹھو کا پنجرہ درست نہ کرایا گیا تو ایک دن یہی ہوگا۔ پنجرہ کی کھڑکی موئی جس دن سے ڈھیلی ہوئی پھر لاکھ کہا کسی نے درست نہ کرائی،

اب تو سب کے کلیجہ میں ٹھنڈک پڑ گئی ہوگی۔ اب تو وہ بولنے بھی لگا تھا
میں نے اُس کو بڑی ایسا مول لیکر پالا تھا۔ اب کیسا موٹا تازہ ہوگیا تھا"
بیگم صاحبہ نے الگ گھر سر پر اُٹھا رکھا تھا اور مٹھو میٹے الگ بلی کے مُنہ سے
"ٹیں ٹیں" کر رہے تھے، آخر کار ایک آدھ گھنٹہ کی بھاگ دوڑ کے بعد
ہمارا لٹھ بلی پر پڑا اور اُس نے مٹھو کو مُنہ سے چھوڑا اور مٹھو پر جھاڑ کر خاموش
ہوئے۔ اب اُن کا طبی معائنہ شروع ہوا کہ ضرب شدید ہے یا خفیف؟
بیگم صاحبہ تو خیر اب بھی مایوس تھیں لیکن اور لوگوں نے کہا کہ کوئی زخم نہیں
آیا ہے خدا نے بال بال بچا لیا۔

مٹھو میٹے کو بلی کے مُنہ سے بچانے کو تو ہم نے بچا لیا لیکن بعد میں
اپنی اس حماقت پر افسوس بھی ہوا کہ یہ قصہ ختم ہو رہا تھا تو ایک دن کی
آفت اور مصیبت برداشت کر کے ختم ہو جاتے تھے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ
"جس کو خدا رکھے اُس کو کون چکھے۔ مٹھو میٹے کی زندگی تھی لہٰذا بلی اُن کا
کچھ نہ بگاڑ سکی اور وہ زندہ رہے۔ لیکن اب تو ہم کو بھی اُن سے محبت
ہو گئی تھی اس لیے کہ بیگم صاحبہ نے تعلیم دینا چھوڑ دی تھی اور وہ خود
ایک تعلیم یافتہ کی طرح ہر وقت قابلیت بگھارا کرتے تھے بلکہ ہم پر تو

ایسے مہربان تھے کہ ہمارا اب اُن سے خفا ہونا محسن کُشی اور احسان فراموشی کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ صبح تڑکے سب سے پہلے مٹھو بیٹے ہی کی آواز سنائی دیتی تھی جو گلشن کو اُٹھاتے تھے۔

"میاں کا پیارا پیارا مٹھو ہے، گلشن اُٹھ، گلشن اُٹھ، میاں کے لیے چائے لا۔ بنی جی بھیجو، مدد اللہ کی، ٹیں ٹیں"

اور اس کے بعد جب وہ سب سے پہلے ہم کو دیکھتے تھے تو خود بخود فرماتے تھے۔

"میاں آداب عرض کرتا ہے مٹھو، میاں کا پیارا پیارا مٹھو، حق اللہ پاک ذات اللہ، ٹیں ٹیں، پاک نبی رسول اللہ"

اور بیگم صاحبہ کا تو یہ حال تھا گویا جوان اولاد سے اُن کا کلیجہ ٹھنڈا ہو رہا ہے، بوڑھاپے میں سُکھ پا رہی ہیں جس وقت مٹھو بولتا تھا بس اُنکی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، مارے خوشی کے پھولی نہ سماتی تھیں، حالانکہ ایک فخر آمیز انکسار کے ساتھ ہمیشہ گردن جھکا لیا کرتی تھیں، یا اس لیے گردن پھیر لیا کرتی تھیں کہ کہیں خود اپنی ہی نظر نہ لگ جائے لیکن دیکھنے والے دیکھ لیتے تھے کہ ان کا دل باغ باغ ہو گیا ہے، اور واقعی اُنکی

یہ کیفیت قدرتی بھی تھی۔ اول تو مٹھو اُن کا شاگرد رشید تھا، دوسرے اُسکو اولاد کی طرح پالا تھا، پھر کیسے ہو سکتا تھا کہ آج جب وہ پروان چڑھا تھا تو بیگم صاحبہ کا دل باغ باغ نہ ہوتا۔

ایک دن حسب معمول ہم سو کر اُٹھے تو مٹھو بیٹے نے ہم سے کہا:۔

"میاں کا پیارا مٹھو، میاں آداب عرض کرتا ہے مٹھو بیٹا"۔

بیگم صاحبہ بھی بیدار ہو چکی تھیں کہنے لگیں "دیکھو تو کیسے ادب کے ساتھ سلام کر رہا ہے اور تم جواب بھی نہیں دیتے"۔ ہم نے پنجرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "جیتے رہو مٹھو بیٹے"۔ مٹھو بیٹے نے کھڑکی سے گردن نکال کر کہا "میاں آداب کرتا ہے مٹھو بیٹا"۔ کھڑکی پنجرے سے علیحدہ ہو کر زمین پر آ رہی اور مٹھو بیٹے پھُر سے اُڑ کر یہ جا وہ جا۔ بیگم صاحبہ "ارے ارے" کہہ کر رہ گئیں اور ہم اسکی طوطا چشمی دیکھ کر رہ گئے۔ وہ پہلے تو اُڑ کر دیوار پر بیٹھے لیکن جیسے ہی اُن کو پنجرہ دکھا کر کہا گیا "آؤ، آؤ، مٹھو بیٹے، آؤ"۔ وہ وہاں سے اُڑ کر گولر کے درخت پر، اور پھر وہاں سے خدا جانے کہاں اُڑ گئے، ان کا پنجرہ اب تک موجود ہے جس کو دیکھکر بیگم صاحبہ ٹھنڈی آہیں بھرتی ہیں۔ ہاں اُن کے چنے کی دال البتہ

کُلھیا خدا جانے کیا ہو گئی۔ مگر خیر اتنا ضرور ہوا کہ اب جب کبھی آواز آتی ہے "ہیرا من طوطے کا بچہ" تو بیگم صاحبہ جل کر کہدیا کرتی ہیں۔
"آگ لگے کمبخت میں"
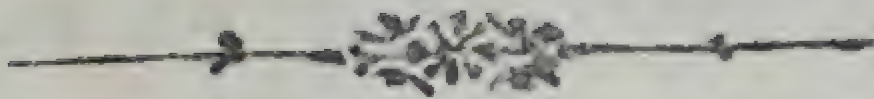
سائکل کی تعلیم

بائیسکل کی تعلیم

ابھی قد اتنا بھی نہ تھا کہ پیر آسانی کے ساتھ بائیسکل کے پیڈل تک پہونچ سکیں کہ سائیکل سواری کے شوق نے گدگدایا اور رفتہ رفتہ اس شوق نے ارمان، آرزو اور تمنا وغیرہ کے تمام مدارج طے کر کے عشق کی صورت اختیار کرلی یہاں تک کہ اب بغیر سائیکل کے زندگی دشوار ہو گئی، ہر وقت اسی کا تذکرہ ہے اور رات کو خواب بھی دیکھتے ہیں تو بائیسکل کا، بات یہ تھی کہ سڑکوں پر کثرت سے اپنے ہم عمروں کو اور اپنے سے بڑے لوگوں کو بائیسکل پر فراٹے بھرتے ہوئے دیکھتے تھے اور کلیجہ تھام کر رہ جاتے تھے کہ ایک یہ ہیں جن کو زندگی کا لطف حاصل ہے۔ دنیا میں بہشت کے مزے اڑا رہے ہیں۔ بائیسکل کے مالک ہیں اور بائیسکل پر بیٹھکر ہوا میں تیرتے پھرتے ہیں۔ ایک ہم قسمت

ہیں کہ ہماری قسمت میں اور سب کچھ ہے اگر نہیں ہے تو صرف سائیکل۔
جب شوق بڑھ کر عشق کی صورت اختیار کر لیتا ہے اس وقت اُس کا ضبط کرنا انسانی طاقت سے باہر ہوتا ہے خصوصیت کے ساتھ بچپنے میں تو عشق ہو جانا قیامت سے کم نہیں ہوتا، چنانچہ ہمارے بزرگوں کو ہماری دلی کیفیات کا علم تھا بلکہ وہ ہماری مجنونانہ حالت سے تنگ آ گئے تھے اور کسی نہ کسی طرح ہم کو مطمئن کرنے کی فکر میں تھے۔ آخر کار اُدھر سے یہ شرط پیش کی گئی کہ سوار ہونا سیکھ لو تو خرید لی جائے۔ اور ادھر سے یہ ضد تھی کہ خرید دو تو سیکھ لیں گے۔ لیکن یہ گفت و شنید کچھ سر سبز و ادر مسٹر جیکر والی گفت و شنید تو تھی نہیں کہ طے نہ پاتی کچھ ہمارے بڑے بوڑھے جھکے اور کچھ ہم اور آخر کار یہ طے پا گیا کہ ہم کسی پرانی بائسکل پر سوار ہونا سیکھ کر مشق کر لیں تو نئی خرید لی جائیگی ورنہ نئی بائسکل ٹوٹ کر سیکھ چکنے سے پہلے ہی ہم کو پھر نئی بائسکل کی تمنا میں مبتلا کر دیگی۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ شوق شوق سب برابر ہوتے ہیں خواہ وہ بائسکل کا ہو یا خان بہادری کا جیل جانے کا ہو یا گول میز کانفرنس

جانے کا۔ جہاں تک شدومد اور جوش وخروش کا تعلق ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ کوئی شوق بھی اُس سے خالی نہیں ہوتا اور پھر جوش و خروش میں انسان کیا کچھ کر گزرتا ہے اس کو ہم بھی جانتے ہیں اور وہ بھی جانتے ہونگے جو آنریری مجسٹریٹی سے لیکر میونسپل کمشنری اور کونسل یا اسمبلی کی ممبری تک کے کسی شوق میں شدومد اور جوش وخروش سے کام لے چکے ہیں یا لینے والے ہیں۔ اُس وقت انسان ایک قسم کی مرفوع القلم مخلوق ہوتا ہے جس کے یہاں جائز اور ناجائز ہر قسم کی تدابیر یکساں ہوتی ہیں اور وہ اُن کو اختیار کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتا چنانچہ یہی ہوا کہ ہماری بائسکل کی جستجو میں اتفاق سے بہت جلد کامیابی حاصل ہو گئی۔ یعنی ایک دن کوئی صاحب بائسکل پر سوار ہو کر ہمارے کسی بزرگ سے ملنے آئے وہ تو ادھر ملتے رہے اور اُدھر اُن کی بائسکل ہمارے کام آئی، بائسکل لیکر کمپنی باغ کی اُس سڑک پر پہونچے جو فراز سے نشیب کی طرف گئی تھی اور وہاں فطرت کو بہترین معلم جان کر ہم نے بائسکل کی بسم اللہ کر دی۔

بائسکل کے پیڈل پر بایاں پیر رکھکر داہنا اُٹھایا ہی تھا کہ وہ بجائے

آگے چلنے کے لہرا کر اس طرح لیٹ گئی کہ ہم نصف اُسکے قریم میں اور نصف زمین پر دراز فقط آئے لیکن ہم مردانہ وار اُٹھے۔ کپڑے جھاڑے اور بہادرانہ بائسکل کو اُٹھا کر پھر کوشش کی اس مرتبہ بائسکل تھوڑی دُور چل کر خود بخود لڑکھڑائی اور ایک جھٹکے کے ساتھ اسطرح گری کہ ہم بائسکل کو ہاتھوں میں لیے لیے قلابازی کھا گئے اور تھوڑی بہت چوٹ بھی آئی لیکن ہم نے کہا ؎

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں
وہ طفل کیا گریگا جو گھٹنوں کے بل چلے

ہاتھوں سے گھٹنوں کو سہلاتے ہوئے ہم نے پھر مشق کی اور یہ مشق کامیاب رہی اس لیے کہ ہم بجائے گرنے کے بائسکل کو گرا کر خود کھڑے ہو گئے اور جب وہ اچھی طرح گر لی تو پھر اُس کو اُٹھا کر چلے لیکن اب کی مرتبہ بائسکل کو گھوڑدوڑ کے گھوڑوں کی طرح ٹٹی پھاندنا پڑی، یعنی سڑک پر آرام فرمانے والے گدھے سے ٹکرا کر وہ خود ادھر جا رہی اور ہم کو گدھے کا سہارا لیکر اسی کی پیٹھ پر بیٹھ جانا پڑا۔ بہرحال یہ کوئی ایسی بات نہ تھی گدھے کے اُٹھنے سے پہلے ہم خود اُٹھے اور بائسکل کو اس

عزم کے ساتھ اُٹھایا کہ دیکھیں کہاں تک گرتی ہے یا ہم ہی نہیں یا تو ہی نہیں اس وقت ہم کو غصہ آجانا ذرا مفید ہوا کہ ہم نہیں معلوم کتنی مرتبہ غصہ میں خود بخود پیدا ہوجانے والی تیزی کے ساتھ بائسکل اُٹھا اُٹھا کر مشق کرتے رہے یہاں تک کہ بائسکل نے گرنا چھوڑ دیا۔ یا گری تو اس طرح کہ خود گر پڑی اور ہم سنبھل گئے۔

جب یہ مشق اس حد تک پہونچ چکی تو ہم ایک درخت کے سہارے سے گدی پر بیٹھ گئے اور بائسکل کو چھوڑ دیا جو نہایت تیزی کے ساتھ لہراتی ہوئی اُس حد تک چلی کہ اگر نالہ کے پُل سے نہ ٹکرا جائے تو مع ہمارے یقیناً بجائے خشکی کے اُس کو تری میں چلنا پڑے لیکن وہ نالہ کے پل سے ٹکرائی اور ہم کو مُنہ کے بل گرنا پڑا۔ گرنے کی تمام تکلیف اس خیال نے ذہن سے نکال دی کہ ہم بائسکل پر اتنی دُور چل کر گرے ہیں لہٰذا پھر واپس گئے جہاں سے چلے تھے اور پھر اُسی طرح سوار ہو کر بائسکل چھوڑ دی لیکن بائسکل کے روانہ ہوتے ہی معلوم نہیں کمبخت دھوبنیں کہاں سے اُس سڑک پر آگئیں۔ لاکھ لاکھ چیخے چلائے، ہٹو بچو کیا مگر جدھر وہ ہٹیں اُسی طرف بائسکل بھی مڑی اور آخر کار ایک گٹھری سے اُلجھ کر ہم بھی گرے

بائسکل بھی گری اور اُن میں سے بھی ایک بڑھیا مع گٹھری کے چار دن شانے چت ہو گئی۔ وہ یقیناً مری نہیں تھی اِس لیے کہ برابر ہم کو کوس رہی تھی اور ہم اُس کی خوشامد کر رہے تھے۔ بمشکل تمام اُس کو وہاں سے روانہ کیا۔ اور ارادہ کر لیا کہ اب سوار نہ ہونگے مگر دل نے کہا کہ واہ۔

دو چار ہاتھ اب تو لبِ بام رہ گیا

لہٰذا پھر ایک مرتبہ ہمت کی اور بائسکل پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے لیکن چونکہ اُترنا نہیں آتا تھا لہٰذا یہ ضروری تھا کہ کہیں نہ کہیں گریں ورنہ بائسکل کا چلنا بند نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اس خیال سے ہم مطمئن تھے کہ کہیں نہ کہیں گرنا ضرور پڑیگا لیکن دل چاہتا تھا کہ کسی ایسی جگہ گریں کہ چوٹ بھی نہ آئے اور گالیاں بھی نہ کھائیں۔ اگرچہ ہم اس گرنے والے سانحہ کے لیے تیار تھے لیکن دل لرز رہا تھا کہ دیکھیے کیا ہوتا ہے، زندہ رہتے ہیں یا نہیں لیکن بائسکل کی تیز رفتاری نے تھوڑی ہی دیر میں اس کا فیصلہ کر دیا اور ہم کو ایک نہایت ہی مقدس بزرگ سے اس بری طرح لڑایا کر خود تو کمبخت الگ جا پڑی اور ہم کو بڑے میاں کے عین اوپر گرایا۔ وہ بیچارے وظیفہ میں محو تھے کہ یہ ناگہانی آفت آئی کہ خدا ئیا ہم کو ملک الموت

سمجھے ہونگے اس لیے کہ ہم نے اپنے ہوش بجا ہونے کے بعد اُن کو کلمہ پڑھتے ہوے دیکھا اور اپنے کو اُن کے اوپر پڑا ہو۔ ہم جلدی سے اُٹھے اور اُن کو نہایت تعظیم سے اُٹھا کر معافی چاہی لیکن وہ بیچارے کچھ نہ بولے صرف گھورا کیے۔ ہم نے اُن کے کپڑے خود جھاڑے اور اُن کو بائسکل کی طرح چلانے کی کوشش کی لیکن وہ ہم کو روح قبض کرنے کے انداز سے گھور رہے تھے۔ ہم نے جب یہ عالم دیکھا تو اُن کو گھورتا ہوا چھوڑ کر بائسکل کی طرف متوجہ ہوے لیکن اب اس کا یہ حال تھا کہ ہینڈل گھوم کر دوسری طرف ہو گیا تھا چونکہ ہم کو ہینڈل کی اس ساخت کے اعتبار سے اگلے پہیے کی طرف سے سوار ہونا نہیں آتا تھا لہٰذا سائیکل سواری کی تعلیم کو نامکمل چھوڑ کر چوروں کی طرح مجروح بائسکل لیے گھر آئے اور گھر پر جو کچھ ہوا وہ اِس لیے قابل تحریر نہیں کہ اب بیان کرتے ہوے شرم آتی ہے

بڑے اچھے آدمی تھے

بڑے اچھے آدمی تھے

رسالۂ "خضرِ راہ" میں لکھنے کا پہلا اتفاق ہے اور وہ بھی صرف اس لیے کہ اسکے مدیر جناب حامد ندوی میرے دوست بلکہ میرے یارِ غار عبدالمجید صاحب کمال حامدی کے دوست بلکہ یارِ غار ہیں۔ لہٰذا قاعدے کے قاعدے سے وہ میرے بھی دوست ہوئے اور جب دوست ہو گئے تو ان سے جان چھڑانا جس قدر دشوار ہے اُس کو وہی حضرات خوب سمجھ سکتے ہیں جن کو خدا نے دوست دئیے ہیں۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ لکھ کیا رہا ہوں دوستی نباہ رہا ہوں اور وہ بھی مار کے خوف سے۔ آپ جانتے ہوں گے کہ مار کے آگے بھوت بھاگتا ہے، میں تو پھر بھی شوکت تھانوی ہوں۔

یعنی حامد صاحب کی زبردستی ملاحظہ فرمائیے کہ فرماتے ہیں کہ "خضرِ راہ"

کے "شبلی نمبر" کے لیے لکھو، اور لکھو بھی تو مزاحیہ مضمون لکھو ان ذات شریف
اڈیٹر صاحب سے لاکھ لاکھ کہا کہ بھائی میں شبلی نمبر کے لیے کیا لکھوں جہاں تک
علامہ شبلی کی سوانح زندگی کا تعلق ہے میں بالکل کورا ہوں۔ بلاوجہ بات یہ
کہ میں نے کلیات شبلی وغیرہ دیکھی ہے مگر اس پر کچھ لکھنا میرے بس کی بات
نہیں دوسرے اس ذات گرامی کے متعلق جس کے نام نامی سے یہ نمبر
مخصوص کیا جارہا ہے مزاحیہ مضمون لکھوا کر مجھ کو کیوں روسیاہ بناؤ گے؟۔ مگر
حامد صاحب ہیں کہ بس وہ لکھو ہم نہیں جانتے لکھو یہ کیسے جانتے نہیں بہت
اچھا ہم لکھتے ہیں لیکن کان کھول کر سن لیں تمام ندوی حضرات کہ اس
جسارت کے ذمہ داران ہی کے ہم قوم یعنی ایک ندوی بزرگوار جن کو عرف
عام میں حامد ندوی کہتے ہیں اور جو رسالہ "خضر راہ" کے مدیر بھی بن بیٹھے ہیں
رہ گئے ہم تو ہم تو بس بیگار کے مضمون نگار یعنی کرایہ کے ٹٹو ہیں۔
یہ تو سب کچھ ہو گیا لیکن لکھیں تو کیا لکھیں خدا گواہ ہے کہ علامہ شبلی کے
متعلق کسی قسم کی کوئی معلومات نہیں ہے۔ سوائے اسکے کہ ایک لطیفہ ہم کو یاد
ہے کہ ایک مرتبہ بمبئی میں ایک جلسۂ عام کے روبرو ایک بمبئی بزرگوار
علامہ کا تعارف حاضرین سے کرانے کے لیے کھڑے ہوئے لیکن اُن

بیچارے کو جب ہماری طرح دوران تقریر میں یہ محسوس ہوا کہ وہ علامہ کی خدمات پر روشنی نہ ڈال سکیں گے، تو اُنھوں نے سب تعریفیں کرنے کے بعد کہدیا کہ "آپ بڑے اچھے آدمی ہیں"۔ اسی طرح اگر ہم نے اُن کے متعلق کچھ لکھا تو اس کا ماحصل یہی ہوگا کہ "بڑے اچھے آدمی تھے" اور یہ واقعہ بھی ہے کہ ہم اُن کو "بڑا اچھا آدمی" سمجھتے ہیں، مگر افسوس کہ اس سے زیادہ اُن کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔

جہاں تک علامہ شبلی کا تعلق دارالعلوم ندوہ سے ہے وہ لیقیناً سر سید علیہ الرحمہ کی طرح "بڑے اچھے آدمی تھے"۔ جس طرح سر سید علیہ الرحمہ نے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی بنیاد ڈال کر مسلمانوں کو دنیا میں ترقی کرنے کا حق دار بنا دیا۔ بالکل اسی طرح علامہ شبلی کا یہ احسان بھی ناقابل فراموش ہے کہ اُنھوں نے دارالعلوم ندوہ جیسی درسگاہ کا انتظام فرما کے اُن مسلمانوں کو ٹھکانے لگا دیا جو ٹھیٹھ مذہبی تعلیم پانے کے بعد بس "مولانا" ہو کر رہ جاتے تھے اور کچھ نہیں۔ اگر آج کسی عربی درسگاہ کے طالب علم کا مقابلہ کسی ندوی سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن میں سے ایک ہندوستانی ہے تو دوسرا یوروپین مسلمان یعنی لارڈ ہیڈلے کی قسم کا۔ اگر ایک سودیشی ہے تو دوسرا

بدلیشی، بس یہ سمجھ لیجیے کہ ندوہ کے طالب علم "ندوی" ہوتے ہیں۔ اور دوسری عربی درسگاہوں کے طالب علم "بدوی" ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اگر موازنہ "دبیر و انیس" کی طرح موازنہ "ندوی و بدوی" کیا جائے تو اس کے لیے ایک دفتر کی ضرورت ہے۔ بس اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ ایک ندوی مولانا ہوتا ہے مگر فیشن ایبل قسم کا اور ایک بدوی ایسا مسکین مولانا ہوتا ہے گویا براہ راست عرب سے تشریف لا رہا ہے اور دنیا سے منھ موڑے ہوئے بس اللہ میاں کے یہاں جانے کا ارادہ ہے۔ سر منڈا ہوا اس پر ایک چوگوشیہ ٹوپی منڈھی ہوئی، ایک لمبا سا کرتہ اور ٹخنہ کھلا شرعی پاجامہ پہنے ہوئے کندھے پر ایک لمبا سا رومال پڑا ہوا، پیروں میں ایک ہاتھ بھر کا نال جڑا ہوا پنجابی جوتہ اور ہاتھ میں ایک لمبی سی تسبیح، یہ ہوتی ہے ان حضرات کی وضع قطع، اور چہرہ کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ اگر واقعی ان ہی حضرات سے جنت بھر دی گئی تو بیچاری حوریں سہم سہم کر بھاگیں گی۔ اس وضع قطع اور چہرہ کی ساخت میں ایک چیز کا اور اضافہ ہوتا ہے اور وہ چیز "تیور" کا ہیں۔ جن سے ہمیشہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا جنت الفردوس میں اس شان سے یہ حضرات داخل ہونگے جس طرح آج کل گورنر صاحب

دربار میں جاتے ہیں اور جنت گویا ان لمبی لمبی داڑھیوں، گھٹے پڑی ہوئی پیشانیوں، مُنڈے ہوئے سروں اور "ترانیج نما" چہروں کے بغیر بے رونق رہیگی - اگر واقعی جنت کسی ایسی ہی جگہ کا نام ہے تو غالب مرحوم نے سچ کہا ہے ۔ ع

"ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت کیا ہے"

بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ یہ دل کے بہلانے کو بھی اچھا خیال نہیں ہے یعنی اگر اس قسم کی جنت میں اتفاق سے کوئی خوش مذاق انسان بھی پہونچ گیا تو اسکی زندگی کوفت میں بسر ہوگی - جب کہ دنیا ہی میں یہ حال ہے کہ اگر کسی مجمع میں اس قسم کے کوئی بزرگوار پہونچ جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مجمع کو سانپ سونگھ گیا نہ وہ دلچسپیاں باقی رہتی ہیں نہ لطفِ صحبت و زندہ دلی رہتی ہے نہ خوشگواری بس ایک مولانا کی وجہ سے تمام داڑھی منڈوں کا مجمع یاد اللہ میں مصروف ہو جاتا ہے - سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قسم کے مولانا لوگ تسبیح پڑھنے کے لیے غیر مولاناؤں میں تشریف ہی کیوں لاتے ہیں خدا کے فضل سے سیکڑوں مسجدیں اُن حضرات کے لیے موجود ہیں اسکی کیا ضرورت ہے کہ جبہ و دستار لیے نائی کالر والوں کے

مجمع میں بغیر بلائے رونق افروز ہو جاتے ہیں اور وہاں کے رنگ کو صرف اپنے وجود سے ایسا پھیکا کر دیتے ہیں کہ بس غصہ ہی تو آتا ہے نہ تو آپ کو ٹینس سے ذوق نہ برج سے کوئی شوق۔ بس آپ سے تو گناہ اور ثواب کی باتیں لے لیجئے۔ ہر شخص سے جواب طلب ہوتا ہے کہ آپ نے داڑھی کیوں منڈوائی آپ نے سوٹ کیوں پہنا، آپ نماز کیوں نہیں پڑھتے، آپ کے روزے کیوں قضا ہو رہے ہیں، آپ مسجد میں کیوں نہیں آتے؟۔ کوئی پوچھے آ جناب کون ہیں۔ جو ہر شخص پر چارج شیٹ لگاتے چلے جاتے ہیں؟ نماز نہیں پڑھتے تو خدا کے گنہگار ہیں، داڑھی نہیں رکھی تو اسکے جوابدہ خود ہیں، سوٹ پہنتے ہیں تو انگریزوں کے ساتھ حشر ہو گا۔ یا اگر مولانا کی دھمکیوں کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو جہنم میں جائینگے مگر آپ کی بلا سے آپ کون ہیں؟ لیکن بات اصل یہ ہے کہ مولانا لوگوں کی ان باتوں کا کھرا کھرا جواب دینا لوگ خلاف تہذیب سمجھتے ہیں۔ ایک مرتبہ اگر کوئی شخص ہمت کر کے ڈانٹ دے تو پھر جرأت نہ ہو۔ یہ لوگ تو خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جب تک آدمی خاموش رہے یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ بیوقوف ہے اس کو جو کچھ جی چاہے کہو جواب تو دے ہی نہیں سکتا،

خدا کا نہ سہی کم از کم ان باتوں سے ہمارا رعب تو جم ہی جائیگا اور بہت ممکن ہے کہ اس بہانہ سے ہمارا مریدبھی ہو جائے۔

ان بدوی قسم کے مولاناؤں کو اپنے زہد و اتقا کی نمائش کا ایسا شوق ہوتا ہے کہ ریش مبارک میں کبھی قینچی بھی نہیں لگنے دیتے کہ مبادا اختصار ہو جائے اور عوام مجائے "مولانا" سمجھنے کے "دہلی کا تاجر" سمجھنے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ "یکمشت چار انگشت" والی داڑھی چار مشت یک انگشت" تک ترقی کر جاتی ہے اور اگر اس میں اس سے بھی زیادہ درازی کی صلاحیت موجود ہے تو مولانا مضائقہ نہیں سمجھتے اس لیے کہ یہی داڑھی دعوتوں میں پلاؤ کا ہاتھ پھیرنے، محافل میلاد میں شیرینی کو مکھیوں سے بچانے اور مساجد کی مرمت کے لیے چندہ وصول کرنے کے کام آتی ہے اور اس کے علاوہ مولانا کی مولانائیت کا تمام تر دارومدار اسی پر ہے۔

کم از کم دارالعلوم ندوہ کے فارغ التحصیل ندوی حضرات میں یہ خوفناک قسم کی مولانائیت نہیں ہوتی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ لوگ بھی داڑھی رکھتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ان کے سروں پر انگریزی

بال بھی پائے جاتے ہیں وہ داڑھی رکھنے کے بعد مونچھوں کو بڈھے مولاناؤں کی طرح صاف نہیں کرا دیتے اور نہ وہ اپنی داڑھیوں کو اتنا آزاد کر دیتے ہیں کہ جہاں تک جی چاہے چلی جائیں کوئی حد ہی نہیں ہے "انگریزی بال اور "معتدل ریش" کے علاوہ ان میں اور بھی بہت سی باقاعدگیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً وہ شیروانی پہننا جانتے ہیں۔ قمیص پہننے کو بھی گناہ نہیں سمجھتے، ترکی ٹوپی پہن لیتے ہیں، پیروں میں فل بوٹ نہیں تو کم از کم بوٹ تو ضرور پہن لیتے ہیں اور اگر بہت زیادہ مولانائیت غالب ہے تو پمپ پر اکتفا کرتے ہیں یہ نہیں کہ ایک ہاتھ کا پنجابی جوتا خریدا اس میں گھوڑے کے قسم کی نالیں جڑوائیں اور تیل میں بھگو کر پہن لیا۔ وہ لوگ جرابیں پہننا بھی جانتے ہیں اور شیروانی کی جیب میں فاؤنٹن پن بھی رکھتے ہیں۔ یہ تمام علامات اس بات کی ہیں کہ ندوہ میں روشن خیالی کا عنصر موجود ہے۔

علامہ شبلی نے بہت سی قابل قدر خدمات انجام دی ہونگی ورنہ ظاہر ہے کہ نہ "شمس العلماء" ہوتے نہ "علامہ" کہلاتے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "نقش راہ" کا شبلی نمبر نہ نکلتا لیکن ہم تو ان کو اس حیثیت سے

"بڑا اچھا آدمی" سمجھتے ہیں۔ کہ انھوں نے بہت سے مسلمانوں کو "مولانا" بننے سے بچا کر "انسان" بنا دیا۔ ورنہ یہ جو آج کل ندوی علما دکھائی دیتے ہیں۔ سب ایک سرے سے نہایت سخت قسم کے سر گھٹے ہوئے مولانا ہوتے اور ان سے بھی "غیر مولانا مسلمانوں کا اسی طرح ناک میں دم ہوتا جس طرح "ندوی" مولاناؤں سے ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ندوی مولانا ہم کو مذہب کی طرف رجوع نہیں کرتے اور دہریت سے نہیں بچاتے لیکن آپ ہی بتائیے کہ ایک شخص کے لیے جو سر سے پیر تک ہیٹ سوٹ اور بوٹ میں ملفوف ہو یہ زیادہ آسان ہے کہ وہ سوٹ اُتار کر شیروانی اور ہیٹ اُتار کر ترکی ٹوپی پہن لے یا یہ آسان ہے کہ سوٹ اُتار کر سر منڈوائے چوگوشیہ ٹوپی منڈھے اور داڑھی بڑھا کر مونچھیں منڈوا دے۔ ہمارے خیال میں تو اس تبدیلی سے ندوی فیشن کو لوگ بہرصورت غنیمت سمجھیں گے۔ اس لیے کہ اس تبدیلی کے بعد انسان کی صورت تو باقی رہتی ہے یہ کیا کہ ایک دم سے ایسی شکل و صورت بدل دی کہ دنیا والے ایک غیر جنس سمجھنے لگیں۔

سر سید علیہ الرحمۃ نے علیگڈھ کالج میں جہاں موجودہ تعلیم کو ضروری

سمجھا وہاں دینیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جہاں کالج بنایا وہاں مسجد بھی تعمیر کرائی، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک علیگ اپنی مادری زبان بھی انگریزی بنا لینے کے بعد "السلام علیکم" کبھی نہیں بھولتا۔ تمام بات چیت انگریزی میں ہوگی لیکن "السلام علیکم" ضرور ساتھ رہیگا اور اگر یہ بھی نہ ہوتا تو واللہ کوئی امتیاز بھی نہیں کر سکتا تھا کہ علیگڈھ کالج میں مسلمانوں کے بچے پڑھتے ہیں یا کسی اور مذہب کے۔ اس لیے کہ ایک شروع سے آخر تک یعنی سر سے پیر تک صاحب بہادر بنا ہوا انسان انگریزی میں گٹ پٹ گٹ پٹ کرتا ہوا نظر آئے تو کون سمجھ سکتا ہے کہ یہ حضرت "ناتادین" ہیں۔ یا "الفریڈ"۔ لیکن "السلام علیکم" سے معلوم ہو جاتا ہے کہ باوجود اس وضع قطع کے یہ بزرگوار خدا کو ایک اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اسکا رسول سمجھتے ہیں اور یقین کرتے ہیں یعنی "مسلمان" ہیں۔ بالکل اسی طرح علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں ندوۃ العلماء میں اپنی دینی تعلیم کو ضروری سمجھا وہاں جدید علوم کی تعلیم کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ ایک ندوی صرف مولانا نہیں ہوتا بلکہ اس میں صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں داخل ہو کر یہ ثابت کرے کہ جہاں میں مسلمان ہوں وہاں

انسان بھی ہوں یہ نہیں کہ بدی مولاناؤں کی طرح مولانا تو ہو گئے لیکن انسانیت
سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اگر علامہ شبلی کی مفید زندگی کے کسی پہلو پر روشنی نہ ڈالی جائے۔ اور
صرف ندوۃ العلما کو پیش نظر رکھ کر کوئی صاحب ہماری طرح شبلی نمبر خضر راہ
کے لیے کوئی مضمون لکھنا چاہیں تو اُن کو صرف اسی حیثیت سے علامہ ایک
"بڑے اچھے آدمی" معلوم ہوں گے ہم تو اُن کو "بڑا اچھا آدمی" سمجھتے
ہیں۔ اور اس سے زیادہ ہم کو کچھ معلوم ہی نہیں لیکن اگر کسی کو کافی
معلومات حاصل ہوں تو وہ اسی مبحث پر "خضر راہ" کے شبلی نمبر میں کافی
لکھ سکتا ہے۔ ہم نے تو جناب حامد بدی اور حضرت کمال حامدی کے
ڈر سے زبردستی یہ سطریں رمضان شریف میں لکھ ڈالیں اور تقاضوں سے جان
چھڑائی۔ وہ تو کہیے کہ ہم بدی یا ندوی کسی قسم کے مولانا نہیں ہیں
ورنہ فتوے دیدیتے کہ رمضان شریف میں کسی قسم کا کوئی مضمون
لکھنا قطعی حرام ہے۔ روزہ مکروہ ہو جاتا ہے بلکہ ٹوٹ جاتا ہے اور
افطار کے بعد لکھنے سے ساٹھ روزے فرض ہو جاتے ہیں۔ یا ایک سو
چالیس مسکینوں کا کھانا۔

نشی

منشی

تپ دق کے متعلق ماہرین طب کی جدید معلومات یہ ہے کہ ہر وہ مرض جو کسی طبیب کی سمجھ میں نہ آئے نہایت آسانی سے دق کہا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ آج دق کی سیکڑوں قسمیں موجود ہیں پھیپھڑے کی دق، حلق کی دق، منہ کی دق، اور ناک کان وغیرہ کی دق۔ مختصر یہ کہ آپ کو اختیار ہے کہ جتنی چاہیں دق کی قسمیں گڑھتے اور تصنیف کرتے چلے جائیں، کسی قسم کی کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ یہی حال اُس مرض کا ہے جس کو عرف عام میں منشی کہتے ہیں۔ بلکہ اس مرض کی قسمیں تو دق سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔ عدالتوں میں دیکھیے تو یہی مرض پھیلا ہوا ہوگا وکیلوں کو آپ اسی مرض میں مبتلا پائینگے۔ کوتوالیوں، تھانوں اور پولیس کی چوکیوں میں آپ کو یہی وبائی بیماری نظر آئیگی یہاں تک کہ آپ مویشی خانہ کو بھی منشی جی سے پاک نہ پائیں گے اور وہ ہندستان

جسکی منفقہ زبان اُردو ہے آپ کو صرف منشیوں سے بھرا ہوا ملیگا۔ حد تو یہ ہے ڈاک خانوں کے سامنے بھی آپ کو کان میں قلم لگائے سڑک پر ٹاٹ بچھائے منی آرڈر فارم گھٹنے پر رکھے اور ناک کی پھنگی پر عینک لگائے ہوئے جو صاحب نظر آئیں گے۔ ان کے متعلق بھی اگر آپ تحقیقات کریں تو آپ کو بھی معلوم ہو گا کہ یہ حضرت بھی منشی ہیں۔

منشیوں کی ان بیشمار قسموں میں سے ہم اُس جدید قسم کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جسکی ولادت حال ہی میں صنعت فلم سازی کے ہمراہ ہوئی ہے۔ چنانچہ آج آپ ہندوستان کی کسی فلم ساز کمپنی کو منشی کے مرض سے پاک نہیں پائینگے اور یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ جب تک ہندوستان کی صنعت فلم سازی اس مہلک مرض سے پاک نہ ہو گی اسکے سرسبز ہونے اور پھلنے پھولنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ مرض اس صنعت کو مدقوق بنائے رکھیگا اور قبر سے ادھر پیچھا نہ چھوڑیگا۔ ہم اس رائے پر کیوں پہونچے ہیں وہ بھی سُن لیجیے :۔

ہمارے ہی محلہ میں ایک صاحب رہتے تھے جن کا اسم مبارک لکھنے کی ضرورت نہیں، صرف خاں صاحب لکھ دینا کافی ہو گا۔

ان خاں صاحب کو تقریباً روز اس خاکسار کے پاس تشریف لانے کی ضرورت پیش آیا کرتی تھی اور وہ بھی صرف اس لیے کہ یہ خاکسار ان حضرت کی ملازمت کا کہیں کوئی انتظام کر دے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں جب کہ گریجویٹ جوتوں پر پالش لگاتے ہیں اور ڈبل گریجویٹ تانگہ ہانکتے ہیں۔ کسی ایسے شخص کو ملازمت دلانا جسکا مبلغ علم اردو کی پہلی، دوسری، تیسری، اور چوتھی ریڈر تک ہو۔ کوئی آسان کام نہیں ہے، لیکن اس بیچارے کے واسطے واقعی متفکر رہتے تھے کہ کس طرح ان کے لیے کوئی ایسا ذریعہ تلاش کر دیں کہ یہ اپنے بچوں کا پیٹ پال سکیں۔ تھوڑے دنوں کے لیے ہم نے ان حضرت کو ایک بزاز کی دوکان پر نوکر رکھوا دیا، اُسکے بعد جب بزاز نے خاں صاحب کو نالائق ٹھہرا کر اپنے یہاں سے نکالا تو آپ کو ہم نے مشورہ دیا کہ کچہری کے پاس بیٹھکر عرضی نویسی شروع کر دیں لیکن اس مشغلہ سے خود خاں صاحب اس لیے جلدی گھبرا گئے کہ انکے متعلق یہ شکایت دو ہی تین دن میں پیدا ہو گئی کہ خط بھی خراب ہے اور املا بھی درست نہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ جس نے بھی آپ سے عرضی لکھوائی اُسی نے اپنی لٹیا ڈبوئی۔ مجبوراً

خانصاحب کو پھر ہم سے کسی جدید مشورے کے لیے تبادلہ خیال کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اتفاقاً اسی زمانہ میں ایک مقامی سینما ہاؤس کے مینیجر صاحب کبھی کبھی تشریف لایا کرتے تھے ہم نے اُن سے کہہ سن کر ان حضرت کو سینما ہاؤس میں چار آنہ والے درجہ کی گیٹ کیپری پر مبلغ پندرہ روپیہ ماہوار سکّہ رائج الوقت کہ نصف جسکے ساڑھے سات روپیہ آٹھ آنہ ہوتے ہیں نوکر رکھوا دیا۔ یہ ملازمت خاں صاحب کو بے حد پسند تھی اس لیے کہ اوّل تو اس ملازمت میں ان کو اپنے علمی کمالات کے مظاہرہ کا کوئی موقع نہ ملتا تھا، دوسرے سب سے بڑی بات یہ تھی کہ چار آنے والے معزز ناظرین سینما پر حکومت کرتے تھے۔ کسی نائی کو بغیر ٹکٹ کے جانے کی اجازت دیدی اور دوسرے دن اسکی دوکان پر جاکر مفت میں بال کٹوا لیے۔ کسی کے یہاں سے اسی معاصرانہ تبادلہ کے ماتحت ترکاری کا لین دین تھا۔ کوئی ان حضرت کی خوشامد میں پان کھلاتا تھا تو کوئی شخص اس لیے سگریٹ پیش کرتا تھا کہ اس کو اچھی جگہ مل جائے پھر ہمارے خاں صاحب کو یہ بات تو بیحد پسند تھی کہ جبتک تماشہ شروع نہیں ہوا اُس وقت تک ٹکٹ وصول کرتے رہے اور اُسکے بعد کالے پردہ مین

مُنہ ڈال کر روز تماشہ مفت میں دیکھتے تھے۔ قصہ مختصر یہ کہ وہ اپنی اس ملازمت سے نہایت خوش تھے اور اُن کی خوشی اور اطمینان کا اندازہ ہم کو اس بات سے ہوتا تھا کہ اب وہ بھول کر بھی ہمارے غریب خانہ کا رُخ نہیں کرتے تھے۔

خاں صاحب کی اس ملازمت کو بمشکل چھ یا سات ماہ گزرے ہونگے کہ ایک دن خاں صاحب نے ناگہانی طور پر غریب خانہ پر قدم رنجہ فرمایا اور ہم کو باہر ہی بیٹھا ہوا دیکھکر قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ ہم خاں صاحب کی اس تشریف آوری سے ذرا متفکر ضرور ہوئے کہ کہیں ان حضرت نے اس ملازمت کو بھی چھوڑ تو نہیں دیا۔ لیکن ان کے تیوروں سے معلوم ہورہا تھا کہ وہ ملازمت کی طرف سے مطمئن ہیں۔ بہرحال ہم نے مزید اطمینان کے لیے پوچھا:۔

"کہئیے خاں صاحب خیریت تو ہے۔ سینما میں بدستور ملازمت ہے نا؟"

خاں صاحب نے فرمایا۔" جی ہاں سینما میں بدستور ملازم ہوں اور بفضلہ سب خیریت ہے"

ہم نے کہا۔" خدا کا شکر ادا کیجیے اور اس ملازمت کی قدر کیجیے کہیں

اس کو بھی نہ چھوڑ بیٹھے گا۔

خاں صاحب نے لاپروائی کے ساتھ کہا: "جی ہاں خدا کا ہزار ہزار شکر و احسان ہے۔ مگر اب میرا ارادہ ذرا بمبئی جانے کا ہے، بات یہ ہے کہ مجھ کو اس وقت روپیہ کی سخت ضرورت ہے اور میں چاہتا ہوں کہ وہاں جاکر اپنا ایک آدھ ڈرامہ کسی کمپنی کے ہاتھ فروخت کر ڈالوں۔

ہم نے حیرت سے کہا: "کیا فرمایا آپ نے ڈرامہ؟"

خاں صاحب نے نہایت معمولی بات سمجھ کر کہا۔ "جی ہاں۔ میں نے دو تین فلمی ڈرامے لکھے ہیں۔ لکھے تو ہیں خیر چھ سات، مگر ان میں سے تین ایسے ہیں کہ ہر فلم کمپنی منہ مانگے دام دیکر خریدلیگی۔"

ہم نے خاں صاحب کو چشمہ لگاکر سر سے پیر تک دیکھا اور پھر کہا۔ آپ کی طبیعت تو اچھی ہے؟"

خاں صاحب نے غالباً ہمارے اس سوال کو نہ سمجھے بغیر فرمایا۔ الحمد للہ کوئی خاص شکایت تو نہیں، وہی معدہ کی خرابی چلی جاتی ہے۔ اب بمبئی جارہا ہوں، انشاء اللہ وہاں اس کا بھی علاج جم کر کر دونگا۔"

ہم نے کہا: "مگر بمبئی جانے کے لیے آپ سے کس نے کہا ہے؟"

خاں صاحب نے کہا :- بات یہ ہے کہ میں نے لکھے ہیں ڈرامے، اور وہ ڈرامے میں نے دو تین کمپنی والوں کو جو میں نے سنائے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ تو بہت آسانی کے ساتھ فروخت ہو سکتے ہیں اور میرا بھی خیال ہے کہ ان ڈراموں کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جائیگا۔ میں ایک ڈرامہ لایا ہوں اسکا تھوڑا سا حصہ آپ سنیے اور دیکھیے کہ آج کل جو ڈرامے عام طور پر آرہے ہیں اُن میں اور میرے اس ڈرامے میں کیا فرق ہے"۔

ہم نے حیرت سے کہا :- "مگر آپ ڈرامہ لکھنا کیا جانتے تھے اور پھر فلمی ڈرامہ"۔

خاں صاحب نے انکساری کے ساتھ تبسّم فرماتے ہوئے کہا۔ "یہ تو خدا کی دین ہے، ملاحظہ فرمائیے، اس کا نام ہے "جلاد کی بیوی"۔ اور پہلا منظر یہ ہے کہ سہیلیاں حمد گا رہی ہیں۔

تو بڑا رحیم ہے　　تو بڑا کریم ہے

تو ہے سب سے اعلیٰ بالا

تیرا ہے یہ عالم سارا

تو بڑا نعیم ہے　　سب سے تو عظیم ہے

ارے ہاں ——— تو بڑا رحیم ہے

ارے ہاں ——— تو بڑا کریم ہے

سہیلیاں دو قطاروں میں ناچتی ہوئی داہنے اور بائیں ہاتھ کی طرف چلی جاتی ہیں اور فوراً ایک کمرہ کی تصویر سامنے آجاتی ہے جس میں ایک خوبصورت شخص سوٹ پہنے ہوئے بیٹھا ہوا گانا گا رہا ہے۔ ؎

تم نے تو مجھے بالکل دیوانہ بنایا ہے — اور قلب کو میرے بھی پیمانہ بنایا ہے

اس شعر کو وہ دو مرتبہ پڑھتا ہے پھر گٹکری لیکر دوسرا شعر پڑھتا ہے۔ ؎

ایسے ہی ترے عاشق جانباز بنے ہونگے — ہم نے اپنے گھر کو در جانانہ بنایا ہے

ہم نے اب تک تو ضبط کیا مگر اب مجبوراً کہہ اٹھے: "خانصاحب یہ شعر تو موزونیت سے بھی بالاتر ہے۔

خانصاحب نے کہا: "آپ نہیں جانتے، میں نے گا کر دیکھ لیا ہے طبلہ اور ساز پر ٹھیک اُتریگا۔ آگے سنیے،

اس شعر کو بھی دو تین مرتبہ گانے کے بعد وہ تیسرا شعر گاتا ہے۔ ؎

اغیار کا تو حامی اللہ ہمارا ہے — اسی نے تو ہمکو تیرا دیوانہ بنایا ہے

اس شعر کے پڑھتے ہی ایک نہایت خوبصورت لڑکی ساڑی باندھے

بال کھولے ہوئے دوڑتی ہوئی آتی ہے اور اس شخص کے پاس آکر ذرا شرم سے کہتی ہے :-

پیارے موہن، تم نے تو ایسا گانا گایا کہ میں بیتاب ہو گئی زندگی میری عذاب ہو گئی، میں خانہ خراب ہو گئی۔"

موہن ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا ہے "پیاری شیلا تم نہیں جانتیں" سے

جنھیں ہے عشق صادق وہ کہیں فریاد کرتے ہیں
لبوں پر مُہر خاموشی دلوں میں یاد کرتے ہیں
اسے گانا نہیں آہ دل عاشق سمجھ اس کو
اسی نالے کے ذریعے انکو ہم آباد کرتے ہیں

شیلا آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتی ہے۔ "آہ پیارے موہن، ہماری اور تمھاری زندگی اب کیونکر بسر ہو گی اور اس شام جُدائی کی کیسے سحر ہو گی۔"

موہن :-

اگر ہے عشق تو کوئی بھی آپتی در بدر ہو گی
شب و روز ہو گی یعنی دیکھنا شام سحر ہو گی
اُسی دن عشق کو تم میرے سچا جانو گی شیلا
مرے مرنے کی جب دن آپ کو گھر میں خبر ہو گی

خاں صاحب جھوم جھوم کر اپنا ڈرامہ سُنا رہے تھے اور ہمارا یہ حال تھا کہ دماغ چکرانے لگا تھا، بار بار ہم نے ارادہ کیا کہ خاں صاحب سے کہدیں

کر بس کیجیے، اندازہ ہو گیا کہ یہ ڈرامہ کیسا ہو گا۔ مگر خانصاحب سانس ہی نہ لیتے تھے، چنانچہ جیسے ہی ہم نے ارادہ کیا کہ ان کو روکیں، اُنھوں نے جھوم کر ڈرامہ پڑھنا شروع کیا۔

شیلا سسکیاں لے لے کر رونا شروع کرتی ہے اور رو رو کر گاتی ہے ؎

خدا کرے کہ محبت میں موت آجائے　　خدا کرے کہ غم دل مجھی کو کھا جائے

ہم نے کہا "خانصاحب یہ کیا خلاف وضع موزوں شعر کیسے کہدیا۔"

خانصاحب نے کہا "اس موقع پر ایسے ہی شعر کی ضرورت تھی۔ شیلا سسکیاں لے لے کر اس شعر کو پڑھتی ہے اور موہن بھی روتا ہے۔ دوسرا شعر موہن پڑھتا ہے۔ ؎

تجھے نہیں مجھے الفت میں موت آجائے　　تجھے نہیں غم دل مجھکو آکے کھا جائے

دونوں روتے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں اور فوراً ہی دوسرا منظر شروع ہوتا ہے۔

قبل اسکے کہ خانصاحب دوسرا منظر شروع کریں ہم نے کہا "خانصاحب بس کیجیے، میں نے اندازہ کر لیا کہ یہ ڈرامہ کیسا ہو گا۔"

خانصاحب نے خود ہی کہا کیسا ہو گا، جب فلم میں آجائے تب دیکھیے گا

کہ یہ ڈرامہ کیا چیز ہوتا ہے"

ہم نے کہا "مگر خانصاحب! اسکے متعلق آپ یہیں سے خط و کتابت کرنے تو اچھا تھا، اس ڈرامہ کو آپ بذریعہ ڈاک بھیجدیں، اگر پسند آگیا تو پھر آپ چلے جائیے گا اور دام طے کر لیجیے گا"

خانصاحب نے ہم کو بیوقوف سمجھ کر ہنستے ہوئے کہا "واہ واہ واہ۔ ڈرامہ اگر میں بھیجدوں تو وہ اس کو فوراً نقل کر کے چرالیں گے اور مجھ کو ایک ڈبل بھی نہ ملیگا"

ہم نے کہا "خانصاحب بات یہ ہے کہ اس طرح آپ لگے ہوئے روزگار کو چھوڑ کر جائینگے۔ میں تو اس سے ڈرتا ہوں کہ کہیں ع

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

والا قصہ خدانخواستہ نہ پیش آئے"

خانصاحب نے کہا "نہیں آپ اطمینان رکھیں آپ مجھکو نہایت اچھی حالت میں پائیں گے"

خانصاحب اس قسم کی گفتگو کرنے کے بعد ہم سے رخصت ہوئے اور ہم نے اُن کی طرف سے مایوس ہو کر اُن کو ان ہی کی حالت پر چھوڑ دنیا

مناسب سمجھا۔ کچھ ہی دن کے بعد ہم نے یہ خبر بھی سُن لی کہ خاں صاحب بمبئی سدھار گئے۔

اس واقعہ کو بمشکل سات آٹھ مہینے گزرے ہونگے کہ ایک روز ہم دیکھتے کیا ہیں کہ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہنے ہوئے بید ہلاتے اور مُنہ سے سیٹی بجاتے ہوئے خاں صاحب غریب خانہ کی طرف تشریف لا رہے ہیں۔ ہم کو دیکھتے ہی خاں صاحب نے ایک مرعوب کرنے والے انداز سے کہا "السلام علیکم" ہم نے مصافحہ کرتے ہوئے خاں صاحب کو اپنے قریب بٹھا لیا اور مزاج پرسی وغیرہ کے بعد اُن سے پوچھا "کب تشریف لائے؟"

خاں صاحب نے کہا "کل ہی آیا ہوں، یہاں لکھنؤ میں ایک کچھ مناظر میرے فلم کے لیے جائیں گے، اُنکے لیے آیا ہوں"

ہم نے کہا "اور مشغلہ کیا ہے کچھ تفصیل سے بتاؤ تو سہی؟"

خاں صاحب نے کہا "اللہ کا شکر ہے کہ ایک فلم کمپنی میں منشی ہوں، پانچ سو روپیہ تنخواہ ملتی ہے اور مکان کمپنی کی طرف سے ہے۔ اسکے علاوہ دوسری کمپنیوں کو بھی معاوضہ پر ڈرامے وغیرہ دیتا رہتا ہوں، آٹھ نو سو

روپیہ ماہوار آمدنی کا اوسط ہے۔

ہم نے خاں صاحب کو حیرت سے دیکھا اور اندازہ کیا کہ یہ شخص جھوٹ نہیں کہہ رہا ہے اس لیے ظاہری شان بھی ان کے بیان کی شہادت دے رہی تھی۔ کم سے کم یہ ضرور معلوم ہوتا تھا کہ خاں صاحب خوش ہیں اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس میں ظاہر ہے کہ انکی ذاتی قابلیت کو کوئی دخل نہ تھا بلکہ یہ ثبوت تھا ہندوستانی صنعت فلم سازی کی پستی اور بدتمیزی کا ذرا غور تو کیجیے کہ جب ہمارے محترم جناب خانصاحب کے ایسے ڈرامہ نویس ہو سکتے ہیں تو اس ڈرامہ کا اور اس ڈرامہ کے فلم کا کیا کہنا جو آپ کا نتیجہ فکر ہو۔ ہم ایک عالم استعجاب میں منہ کھولے ہوے اور آنکھیں پھاڑے ہوے غور کر ہی رہے تھے کہ خاں صاحب نے خود ہی اس سکوت کو توڑتے ہوے فرمایا۔

"یہ سب کچھ آپ ہی کا عطا کیا ہوا ہے۔ آپ نے میرے ساتھ جو احسانات کیے ہیں اُن کا بدل مجھ سے ممکن نہیں۔ نہ آپ مجھ کو سینما میں گیٹ کیپر کی حیثیت سے نوکر رکھواتے نہ میں آج اس قابل ہوتا کہ اتنی بڑی تنخواہ حاصل کروں جو میرے خواب خیال میں بھی نہ تھی

ہم نے کہا۔ "خاں صاحب میں تو حیران ہوں کہ کن الفاظ میں آپ کو مبارکباد دوں، مگر یہ تو فرمائیے کہ تنخواہ جو آپ کی پانچ سو روپیہ ہے وہ بصورت نقد ہے یا بمد قرض، یعنی وہ آپ کو ماہ بماہ ملتی رہتی ہے یا کمپنی کے ذمہ واجب الادا ہوتی رہتی ہے۔"

خاں صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں ایک ایک پائی گنوا لیتا ہوں، بات یہ ہے کہ کمپنی والے تو مجھ کو اس خیال سے سونے کی چڑیا سمجھتے ہیں کہ میں لکھنؤ کا ہوں، پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں ان کو مکمل ڈرامہ دیتا ہوں یہ نہیں کہ صرف اسٹوری دیدیا، یا صرف گانے دیدیے، یا صرف مکالمہ دیدیا۔ میں اسٹوری، سینریو، گانے، مکالمہ اور سب کچھ دیتا ہوں یعنی دو تین آدمیوں کا کام خود ہی کرتا ہوں دوسری کمپنیوں میں ان میں سے ہر کام کے لیے علیحدہ علیحدہ آدمی نوکر ہیں۔

ہم نے کہا۔ "مگر واللہ خانصاحب تم ہو قسمت کے لارڈ کلائیو خیر ماشاء اللہ تم نے خوب ترقی کی، اچھا یہ تو بتاؤ کہ کب تک قیام رہیگا۔"

خانصاحب نے کہا "لکھنؤ میں چھ سات روز کا کام ہے۔ اس کے بعد ہماری پارٹی گوالیار چلی جائیگی۔ اس لئے کہ گوالیار کے قلعہ کا بھی سین

لینا ہے۔ میں نے ڈرامہ میں دکھایا ہے کہ گویا آصف الدولہ نے گوالیار کے قلعہ پر حملہ کیا ہے لہذا امام باڑہ آصف الدولہ کی تصویر لینا بھی ضروری تھا اور گوالیار کے قلعہ کے مناظر بھی لیے جائینگے، یہ ایک تاریخی فلم ہے اور اسکی بڑی دھوم ہے۔ ابھی سے اس میں دکھایا گیا ہے کہ مہاراجہ گوالیار لکھنؤ کی چھتر منزل تک گوالیار سے سُرنگ لگاکر آپہونچا۔ اسکے بعد نواب آصف الدولہ نے گوالیار پر جوابی حملہ کیا اور قلعہ کو فتح کر لیا۔ اس جنگ میں آصف الدولہ کی طرف سے شیر شاہ لڑ رہا ہے اور مہاراجہ گوالیار کی طرف سے راجہ ٹوڈرمل۔ سب تاریخ ہند حصہ اوّل اس فلم میں بھری پڑی ہے۔"

ہم نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا "آپ نے ڈرامہ لکھنے سے پہلے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ ہند خوب اچھی طرح پڑھی ہے۔"

خاں صاحب نے کہا "جی اور کیا کوئی آسان کام ہے ڈرامہ لکھنا بعض اوقات تو جغرافیہ تک کا بھی کام آپڑتا ہے۔"

خدا کی شان دیکھیے کہ اس نکتہ تراش کو بمبئی کی فلم کمپنی پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ دے رہی تھی اور یہ بے مروّت چند ڈرامہ نویسی کی

غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آرہا تھا کہ اس وقت ہم اس فریب خوردہ قابلیت سے ہمدردی کریں یا فلم کمپنی سے جس میں منشی تھے یا اُس ہندوستان سے جس نے خانصاحب کا ایسا مایۂ ناز شیکسپیر ہند اور ان شیکسپیر ہند کی قدر دان فلم کمپنی کو اس ملک میں پیدا کیا تھا، جس ہندوستانی صنعت فلم سازی کی ترکیب خانصاحب جیسے عناصر سے ہو اس صنعت سے ترقی کی اُمید رکھنا سوائے حماقت کے اور کیا ہو سکتی ہے‘ بہرحال اس وقت تو خاں صاحب ہم پر رعب جما ہی رہے تھے اور ہم اُن سے مرعوب ہونے کے لیے مجبور تھے اس لیے کہ ہم ٹھہرے ایک غیر متعلق آدمی‘ اور وہ ٹھہرے ایک مستند ڈرامہ نگار اور ذمہ دار منشی۔ ہم نے بات ٹالنے کے لیے اُن سے کہا:۔

”بڑا لطف رہتا ہوگا اسٹڈیو میں؟“

خاں صاحب نے ذرا اکڑ کر کہا۔ ”کچھ نہ پوچھیے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنت الفردوس میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہر طرف حوریں ہی حوریں نظر آتی ہیں، اور سب تابع فرمان، اجی وہ تو وہ خود مالک کمپنی صاحب، اور ڈائرکٹر صاحب بھی آپ کی دعا سے آپکے غلام ہی بنے رہتے ہیں۔ ہر وقت

کیا مجال کہ اس خاکسار کے کسی حکم کو ٹال تو دیں۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ آپ کی دعا سے اتنا اثر ہے کہ گویا سب زر خرید ہیں۔ اور اس کمپنی میں کیا بمبئی آکر دیکھیے تو پتہ چلے کہ طوطی بول رہا ہے آپ کے نیاز مند کا۔"

ہم نے کہا "کیوں نہیں صاحب ع کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی۔"

خاں صاحب نے کہا۔ "اچھا یہ بتائیے کہ اب بمبئی کب تشریف لائیے گا ضرور تشریف لائیے بلکہ میرے ساتھ ہی واپس چلیے۔"

ہم نے تکلف سے نہیں، بلکہ واقعی کہا۔ "اجی ہم کہاں جا سکتے ہیں مصروفیت سر اُٹھانے نہیں دیتی، بہرحال اگر اتفاق سے کبھی آ گئے تو ظاہر ہے کہ آپ ہی پر دھرنا دینگے۔"

خاں صاحب ادھر اُدھر کی گفتگو کر کے تشریف لے گئے اور ہم بھی اپنے کام میں مصروف ہو کر اس ملاقات کے خیالات کو محو کرنے پر مجبور ہوے۔ پھر نہ خاں صاحب سے ملاقات ہوئی نہ اُن کا خیال آیا۔ لیکن اتفاق سے دو ہی مہینہ کے اندر ایک عزیز کی شادی کے سلسلہ میں ہمکو ناگہانی طور پر کچھ اس طرح بمبئی جانا پڑا کہ ہم خاں صاحب کو اطلاع بھی نہ دے سکے اور ایک دم بمبئی پہونچ گئے۔ بمبئی میں شادی کی مصروفیات

نے دو روز تک مہلت ہی نہ دی، لیکن تیسرے دن ہم خاں صاحب کی فلم کمپنی ڈھونڈتے ہوئے دادر پہونچ گئے اور وہاں اُنکی کمپنی کا سُراغ لگا ہی لیا۔ لیکن کمپنی میں پہونچ کر ہم کو جن صاحب کے پاس پہونچایا گیا وہ کچھ عجیب ہوش سے تھے، اوّل تو ہم کو کرسی ہی نہ دی۔ دوسرے خاں صاحب کی شان میں گستاخیاں شروع کر دیں۔ ہم نے جیسے ہی پوچھا کہ منشی صاحب کہاں تشریف رکھتے ہیں۔ اُس مُشٹنڈے نے کہا "ہم نئی جانتا یا کون مونشی ہے روٹی والا کی دوکان پر تم پوچھو"

ہم نے حیرت سے کہا "جناب میں آپ کے ڈرامہ نویس منشی یعنی خاں صاحب کو پوچھ رہا ہوں جو لکھنؤ کے ہیں وہ بھلا روٹی والے کی دوکان پر جائیں گے"۔

اُس بداخلاق جانور نے ہم کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو ہمارے پتلون کا جیب میں بیٹھا ہے نکال لو۔ تم سے بولا کہ روٹی والا کی دوکان پر دیکھو"

ہم مایوس ہو کر وہاں سے نکلے ہی تھے کہ خانصاحب ایک تہبند باندھے واسکٹ اور اسکے نیچے بنیائن پہنے کندھے پر تولیا ڈالے آتے

ہوئے نظر آئے۔ ہم ان کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ایک اور پارسی قسم کی انسان نما مخلوق نے ان کو بڑی زور سے ڈانٹا "او۔ مونشی، تم کہاں گیا تھا، ادھر آؤ۔ ایک پاکٹ قینچی سگریٹ گھوڑا مارکہ دیا سلائی لاؤ۔"

ہمارے خاں صاحب تعمیل حکم میں پیسے لیکر فوراً لپکے، ادھر ہم نے ایک ملازم سے پوچھا کہ یہ کون صاحب تھے جنھوں نے سگریٹ منگائی ہے، اس نے بتایا کہ ایک چیف ایکٹر ہیں۔ ہم نے اس آدمی کو آڑ میں لے جاکر خاں صاحب کے متعلق متعدد سوالات کیے اور جو جوابات اس نے دئیے۔ ان کے بعد ہم نے یہ فخر اپنے لیے کسی طرح گوارا نہ کیا کہ خاں صاحب سے یہاں ملیں۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ منشی تھے تو ضرور مگر بجائے پانچ سو کے پچیس روپیہ تنخواہ پاتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی آمدنی اس طرح ضرور ہو جاتی تھی کہ کوئی مر بھکا ڈرامہ نویس کوئی ڈرامہ لکھکر لایا، آپ نے اُس ڈرامہ کو مسترد کرا دیا اور جب وہ مایوس ہو کر واپس جانے لگا تو تیس پچاس روپیہ دے کر ڈرامہ لے لیا اور اس کو ادھر اُدھر سے کاٹ چھانٹ کر لی اگر وہ ٹنک کا ہوا تو بے ٹکا بنا کر کمپنی کے ہاتھ دو ڈھائی سو روپیہ کا بیچ لیا۔ چنانچہ یہ بھی معلوم ہوا کہ جس زمانہ میں آپ لکھنؤ تشریف

لے گئے تھے اس زمانہ میں اتفاق سے دو اسی قسم کے ڈرامے بک گئے
تھے لہذا قانوناً شرعاً اخلاقاً ہر حیثیت سے آپ کو اس کا حق پہونچتا
تھا کہ اپنے کو پانچ سو روپیہ ماہوار کا ملازم ظاہر کریں۔ ہم ان کے اوپر
لاحول پڑھتے ہوئے اُلٹے پیروں واپس ہوئے اور اب تک جب سال
دو سال کے بعد اُن سے ملاقات ہو جاتی ہے اور وہ ڈینگ ہانکتے
ہیں تو ہم لاحول ولاقوۃ کا وظیفہ شروع کر دیتے ہیں اور دل یہی چاہتا
ہے کہ قینچی سگریٹ اور گھوڑا مارکہ دیا سلائی منگانے کا انکو حکم دیدیں۔

4764